تحقیقی وتنقیدی مجلّہ

دریافت

جلد: 17 شمارہ: 01

شعبہ اردو زبان وادب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

بسم الله الرحمن الرحيم

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

۱۔ "دریافت" ایچ۔ای۔سی(HEC) سے منظور شدہ"Y" کٹیگری کا حامل تحقیقی و تنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے غیر مطبوعہ مقالات ایچ۔ای۔سی(HEC) کے طے کردہ اصول وضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

۲۔ تمام مقالات کا اشاعت سے قبل اندرون ملک اور بیرون ملک ماہرین سے "Double Blind Peer Review" ہوتا ہے جس میں دو سے تین ماہ لگ سکتے ہیں۔

۳۔ دریافت کی اشاعت سال میں دو دفعہ بالترتیب جون اور دسمبر میں ہوتی ہے۔

۴۔ "دریافت" کا اختصاص اردو زبان وادب کے درج ذیل زمروں میں معیاری مقالات کی اشاعت ہے:

ا۔ تحقیق: متنی / موضوعی۔ ب۔ مباحث: علمی / تنقیدی۔

ج۔ مطالعہ ادب: اردو فکشن / شاعری۔ د۔ تنقید و تجزیہ: اردو فکشن / شاعری، اقبال شناسی وغیرہ

۵۔ تراجم اور تخلیقی تحریریں مثلاً غزل، نظم، افسانہ وغیرہ قطعاً ارسال نہ کی جائیں۔

۶۔ "دریافت" میں مقالہ بھیجنے کے بعد اس کے انتخاب یا معذرت کی اطلاع موصول ہونے تک مقالہ کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

۷۔ "دریافت" کی ایچ۔ای۔سی(HEC) میں طے شدہ درجہ بندی 'اردو' ہے۔ دیگر شعبہ جات کے اسکالرز مقالات نہ بھیجیں۔

۸۔ مقالہ اُردو زبان میں ہونا چاہیے۔ کسی دوسری زبان میں لکھا جانے والا مقالہ ناقابلِ قبول ہو گا۔

۹۔ مقالہ بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خیال رکھا جائے:

i۔ مقالہ صرف OJS(https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft) پر ارسال کیا جائے۔

ii۔ نمل ریسرچ پالیسی کے مطابق مقالے کی فیس -/13,000 روپے مقرر کی گئی ہے تفصیل کے لیے ویب گاہ ملاحظہ کیجیے۔

iii۔ مقالے کا عنوان، محقق کا نام اور عہدے کے متعلق تمام تفاصیل اُردو اور انگریزی کے درست ہجوں کے ساتھ درج کی جائیں۔

iv۔ مقالے کا ملخص (Abstract) اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریباً ۱۵۰-۲۰۰ الفاظ پر مشتمل ہو۔ نیز مقالے کے کلیدی الفاظ Keywords بھی انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں لکھے جائیں۔

v۔ مقالے کی موصولی، مقالے کا قابلِ اشاعت ہونے یا نہ ہونے کی اطلاع صرف برقی پتا(E.Mail) کے ذریعے دی جائے گی۔ اس لیے مقالہ نگار اپنا مستند برقی پتا، اپنا مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی درج کریں۔

vi۔ مقالے کے ساتھ الگ صفحے پر حلف نامہ منسلک کیا جائے کہ یہ تحریر غیر مطبوعہ ہے، مسروقہ یا کاپی شدہ نہیں ہے۔

vii۔ کمپوزنگ Microsoft Word میں ہو۔ (فائل: A4، مارجن چاروں جانب ایک انچ)۔ متن کا فونٹ سائز ۱۳ رکھا جائے۔ مقالے میں ہندسوں کا اندراج اردو میں ہو۔ مقالے کے لیے صفحات کی تعداد کم از کم ۱۰ سے ۱۵ ہے۔

viii۔ مقالے کے آخر میں حوالہ جات اردو کے ساتھ ساتھ Roman Script میں بھی ضرور درج کیے جائیں۔ بصورت دیگر مقالہ قابل قبول نہیں ہو گا۔

ix۔ حوالہ جات میں ایم ایل اے(MLA) فارمیٹ کی پیروی کی جائے۔

x۔ مقالے میں کہیں بھی آرائشی خط، علامات یا اشارات استعمال نہ کیے جائیں۔

xi۔ مجوزہ شرائط پوری نہ ہونے کی صورت میں مقالہ رد کر دیا جائے گا۔

دریافت

جلد:17 شمارہ:01

ISSN Online: 2616-6038

ISSN Print: 1814-2885

سرپرستِ اعلیٰ

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری)، ریکٹر

سرپرست

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان، پرو ریکٹر، آر اینڈ ایس آئی ڈویژن

مدیر اعلیٰ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی، ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

مدیر

ڈاکٹر ظفر احمد

معاون مدیر

ڈاکٹر ابو بکر صدیق راٹھور

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

E-mail:daryaft@numl.edu.pk

Web(OJS): https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft

مجلسِ ادارت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

شعبہ اردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، انڈیا

پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم

صدر شعبہ اردو، الازہر یونیورسٹی (گرلز کیمپس)، قاہرہ، مصر

پروفیسر ڈاکٹر رجب درگن

شعبہ اردو زبان و ادب، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، ترکیہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد راغب دیشمکھ

صدر شعبہ اردو، جی۔ ایس سائنس کالج، کھامگاؤں، مہاراشٹر ا، انڈیا

مجلسِ ادارت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

ڈین، فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینٹیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

ڈائریکٹر، انسٹیٹیوٹ آف اردو لینگویج اینڈ لٹریچر، یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر تنظیم الفردوس

صدرِ شعبہ اردو، یونیورسٹی آف کراچی، پاکستان

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی

چیئرمین، شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان

مجلسِ مشاورت (بین الاقوامی)

پروفیسر ڈاکٹر ہائینزورنر ویسلر

ڈپارٹمنٹ آف لینگوسٹک اینڈ فلالوجی، اپسالا یونیورسٹی، سویڈن

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی

شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ڈھاکا، بنگلہ دیش

پروفیسر ڈاکٹر شفیق این وِرانی

ڈپارٹمنٹ فار دی سٹڈی آف ریلیجن، یونیورسٹی آف ٹورنٹو، کینیڈا

پروفیسر ڈاکٹر ضیاالحسن

گریجویٹ سکول آف ہیومینٹیز، یونیورسٹی آف اوساکا، جاپان

ڈاکٹر آرزو چفت سورین

شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکیہ

ڈاکٹر تمثال مسعود

ڈپارٹمنٹ آف مڈل ایسٹرن، ساوتھ ایشین اینڈ افریکن سٹڈیز، کولمبیا یونیورسٹی، امریکہ

مجلسِ مشاورت (ملکی)

پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شاہین

ڈین، فیکلٹی آف اسلامک اینڈ اورینٹل سٹڈیز، یونیورسٹی آف پشاور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر صائمہ ارم

چیئرپرسن، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر سہیل عباس خان

شعبہ اردو زبان و ادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر عامر سہیل

ڈین، فیکلٹی آف آرٹ اینڈ لینگویجز، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور، پاکستان

ڈاکٹر طارق محمود

پرنسپل، کالج آف اورینٹل لرننگ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان

ڈاکٹر محمد آصف

شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

دریافت جلد:17 شمارہ:01(جنوری تاجون2025ء)

ناشر: نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔ مطبع: نمل پرنٹنگ پریس، اسلام آباد

رابطہ: شعبہ اردو زبان وادب، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، ایچ/نائن، اسلام آباد

فون:10-9265100-051/Ext:2262 ای میل: daryaft@numl.edu.pk

ویب سائٹ(OJS):https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft

قیمت فی شمارہ:3000روپے(انفرادی) 3500روپے(ادارہ جاتی)۔بیرون ملک:25 ڈالر(انفرادی) 30ڈالر(ادارہ جاتی)(علاوہ ڈاک خرچ)

فہرست

اداریہ		
ترک فکریات میں مابعد جدیدیت: ناقدین کی آرا کی روشنی میں خصوصیات کا جائزہ	ڈاکٹر آئی کوت کشمیر / زینب بوزکور	۱
عصریت اور ناول :ناول کی تنقید کا ایک نیا زاویہ	ڈاکٹر کامران عباس کاظمی	۱۴
ناصر عباس نیر کے افسانوں کی تحلیل: بیانیہ، فکر اور موضوعاتی جہات	منیر عباس / ڈاکٹر منور امین	۲۳
مولانا حالی کی اصلاحی فکر اور اقبال کی شاعری: تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر سیدہ طیبہ رباب	۵۰
انیس اشفاق کے ناول "ھیچ" میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و سماجی صورتحال	ڈاکٹر سارہ مجید / زنیرہ صدیق	۵۷
"سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں جادوئی حقیقت نگاری	ڈاکٹر محمد رمضان	۶۵
طاہرہ اقبال کے افسانوں میں ثقافتی تصادم کا لسانی اظہار: ایک بین الثقافتی مطالعہ	ڈاکٹر غزل یعقوب / ڈاکٹر محمد امجد	۷۸
اکیسویں صدی کے امریکی اسفار پر مبنی سفر ناموں کا سیاسی اور سماجی جائزہ	نایاب طاہر	۹۰
انڈیکس		۱۰۴

اداریہ

علمی و ادبی دنیا میں تحقیق ایک ایسی بنیاد ہے جو فکر و فن کی تعمیر، فہم و ادراک کی گہرائی اور تہذیبی شعور کی بالیدگی کو ممکن بناتی ہے۔ اردو زبان کا تحقیقی و تنقیدی ادب ان امکانات سے لبریز ہے جو ماضی کی بازیافت، حال کی تفہیم اور مستقبل کے امکانات کو واضح کرتا ہے۔ جریدہ "دریافت" کا موجودہ شمارہ اسی روایت کی ایک خوبصورت کڑی ہے، جو نہ صرف علمی تنوع کا آئینہ دار ہے بلکہ عصری تقاضوں اور فکری ضروریات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ اس شمارے میں شامل مضامین نہ صرف متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ ادبی و فکری مباحث میں نئے زاویے بھی فراہم کرتے ہیں۔

تحقیق علم و ادب کی وہ روشن صورت ہے جو نہ صرف ماضی کی بازیافت کو ممکن بناتی ہے بلکہ حال کے تقاضوں کو سمجھنے اور مستقبل کی راہیں متعین کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تحقیق اب محض روایتی موضوعات تک محدود نہیں رہی بلکہ اس میں فکری تنوع، بین المتونیت، اور بین الاقوامی رجحانات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ مجلّہ دریافت کا موجودہ شمارہ اسی فکری وسعت اور تنقیدی تنوع کا آئینہ دار ہے۔

اس شمارے میں شامل مضامین اردو تحقیق کے مختلف زاویوں پر محیط ہیں۔ کچھ مضامین کلاسیکی فکر اور جدید نظریات کے تقابلی مطالعے پر مبنی ہیں، کچھ افسانوی ادب کی نئی قرأت پیش کرتے ہیں، جب کہ بعض میں عصری مسائل اور عالمی فکری دھاروں کے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ تحقیقی کوششیں اردو تنقید کو نئے افق عطا کرتی ہیں اور قارئین کو علمی مکالمے کی دعوت دیتی ہیں۔

یہ مضامین اردو تحقیق میں نئے مباحث اور تنقیدی بصیرت کے اضافے کا سبب بنیں گے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ قارئین ان مقالات سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کی نئی راہوں کی طرف متوجہ ہوں گے اور علمی مکالمے کو فروغ دیں گے۔

مدیران

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 10th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.410

ترک فکریات میں مابعد جدیدیت: ناقدین کی آرا کی روشنی میں خصوصیات کا جائزہ

Postmodernism in Turkish Thought: An Examination of its Characteristics in the Light of Critics

DR. AYKUT KISMIR [1] AND ZEYNEP BOZKIR[2]

[1] Associate Professor, Department of Urdu, Ankara University, Ankara, Türkiye.
[2] PhD Research Scholar, Department of Urdu, Ankara University, Ankara, Türkiye.
Corresponding author: Aykut Kismir (Aykut.Kismir@ankara.edu.tr)

ABSTRACT In the preparation of this article, the publications of Turkish researchers and especially the book by Prof. Dr. Yıldız Ecevit were used. Postmodernism, which has made its mark in almost every field since the mid-20th century, is a significant intellectual movement. Since its emergence as a literary term and its broader use as a critical concept in the 1980s and 1990s, it has become a crucial cultural, political, and intellectual force defining modernity. In literature, postmodernism introduces innovations in style, technique, and form. Unlike traditional novel structures, which follow a conventional formula of beginning, rise, and climax, the postmodern novel does not adhere to such a framework. The progression of the story includes unexpected twists, and the plot structure allows for flashbacks to past and present events. Postmodernism is regarded as a later stage that liberates humanity from the modernist project of individual, cultural, social, economic, and political transformation, which it protests in nearly every domain.

Keywords Modernism, Postmodernism, Metafiction, cultural, Intertextuality.

مابعد جدیدیت (Postmodernism) عہد حاضر کی ایک اہم اصطلاح اور ادبی تحریک ہے۔ اس کی بنیاد پس ساختیات، لسانی فلسفہ، بین المتونیت، اور رد تشکیل جیسے نظریات اور فلسفوں پر رکھی گئی ہے۔ مابعد جدیدیت کسی بڑی کہانی یا روایت کو مرکزی حیثیت نہیں دیتی، بلکہ مقامی، متنوع، اور کلیت سے کٹی ہوئی چھوٹی کہانیوں کو اہمیت دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت کا نظریہ معروضی حقائق کو تسلیم کرتا ہے اور کہانی کی بناوٹ اور تجرید (abstraction) کی نفی پر مبنی زمانی حقائق کے نظریاتی پہلو کو بنیاد بناتا ہے۔ یہ تکثیریت (pluralism) کو فروغ دیتا ہے اور تنوع کو نمایاں کرتا ہے۔ نتیجتاً، مابعد جدیدیت کو ایک ایسا مرحلہ سمجھا جاتا ہے جو جدیدیت سے آگے ہے اور جو پوری انسانیت کو جدیدیت کی فکر کی روشن خیالی اور بطور احتجاج اس کے انفرادی، ثقافتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی تبدیلی کے منصوبے سے بچاتا ہے۔ مابعد جدیدیت جدیدیت کے خلاف ایک رد عمل کے طور پر سامنے آئی، اور اگرچہ اس میں کچھ مماثلتیں بھی موجود ہیں، مگر اس نے جدیدیت کے رجحانات کی مخالفت کی۔ جہاں جدیدیت اشیاء اور واقعات میں گہرے معانی تلاش کرتی ہے، وہیں مابعد جدیدیت ظاہری سطح پر مرکوز رہتی ہے اور کسی حتمی معنی پیش کرنے سے گریز کرتی ہے۔ جدیدیت عقل اور سائنسی اصولوں پر مبنی

***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

ترکیب (synthesis) کو اپناتی ہے، جبکہ مابعد جدیدیت انسانی تجربے کو متضاد، بکھرا ہوا اور غیر یقینی سمجھتی ہے اور اسی نقطۂ نظر پر توجہ مرکوز رکھتی ہے۔

جدیدیت (Modernism) انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں شروع ہونے والی ایک ایسی تحریک تھی جس نے جلد ہی فن اور ثقافت پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس تحریک کے حامی افراد کا ماننا تھا کہ ثقافتی اور سماجی اقدار پر نظر ثانی کے ذریعے ترقی ممکن ہے۔ ایجو ویت (Ecevit) کے مطابق:

> "یہ ایک ایسا دور تھا جب عقلیت پسند شعور اپنی انتہا کو جا پہنچا، عقل اور سائنس نے سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کی راہیں متعین کیں، اور اپنی عقلی اقدار سے ہٹ کر ہر رجحان اور طرزِ زندگی کو مسترد کر دیا۔"(۱)

اس دور میں روشن خیالی (Enlightenment) کے تصور کے ساتھ فرد کی آزادی کو اجاگر کیا گیا، اور فرد کو مذہبی اثرات سے آزاد ہو کر اپنی سوچ کے مطابق جینے کا موقع ملا۔ ٹیکنالوجی کی ترقی نے بھی انسانی زندگی کے معیار کو تبدیل کر دیا، اور اس تبدیلی نے مصنفین اور دانشوروں کو بھی متاثر کیا۔ کرادومان (Karaduman) کا کہنا ہے کہ:

> "جدیدیت کے ادبی مصنفین نے لاشعور اور فرد کی اندرونی دنیا پر توجہ مرکوز کی، جس کے نتیجے میں کرداروں میں نئی جہتیں پیدا ہوئیں۔"(۲)

دوسری جانب، بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہونے والی جنگوں نے انسانی ترقی کی امیدوں کو مایوسی میں بدل دیا اور فرد کے ذہنی اضطراب میں شدت پیدا کر دی۔ یہی عوامل جدیدیت کی مخالف تحریک، یعنی مابعد جدیدیت کے ابھرنے کی بنیاد بنے۔ مابعد جدیدیت کا نظریہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ کوئی آفاقی حقیقت موجود نہیں ہے اور یہ کہ حقیقت اور اخلاقی اقدار غیر اہم ہیں۔ یہ نظریہ کثرتیت اور تقسیم کو فروغ دیتا ہے اور کسی مخصوص نظریاتی فکر کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ بدلتی ہوئی دنیا اور اختلافات کو برقرار رکھتا ہے۔

مابعد جدیدیت جدیدیت کے سلسلے میں بیان کردہ ایک تصور ہے۔۔ اس لیے مابعد جدیدیت کو سمجھنے کے لیے پہلے جدیدیت کو جاننا ضروری ہے۔ ایجو ویت کے مطابق:

> "جدیدیت کا آغاز نشاۃ ثانیہ سے ہوا جس نے ۱۸ویں صدی میں سائنسی ترقی کے ساتھ مزید فروغ پایا، جبکہ اس میں فرد اور عقل کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔"(۳)

اس دور میں نظم و ضبط اور ترتیب غالب رہی اور جدیدیت کا اصولی اور ضابطہ بند ڈھانچہ نمایاں ہوا۔ کراوغوز (Karauğuz) جدیدیت کو "فرد کے بیدار ہونے کا عمل" قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ "اس مرحلے میں انسان خود کو اور فطرت کو دریافت کرے گا۔"(۴) تاہم، جدیدیت میں تنوع کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی؛ بلکہ اس میں یکسانیت پر زور دیا گیا، جس کے نتیجے میں مختلف ثقافتوں کو ضم کرنے اور تخفیف اختلاف کی پالیسی اپنائی گئی۔ ینگ کے مطابق:

> "نوآبادیاتی نظام اور سامراجیت ایک قوم کو دوسری قوم کے تابع کرنے کے طریقوں پر مشتمل

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

رہے ہیں۔" اس تناظر میں، جدیدیت کی تاریخ براہِ راست سامراجیت اور نو آبادیاتی نظام سے جڑی ہوئی ہے۔"(۵)

دوسری عالمی جنگ کے بعد افراد کے ذہنی اضطراب میں اضافہ ہوا۔ ایک ایسا نقطہ نظر جس کی بنیاد غیر مقامی اور بے ترتیب تھی مسائل کا حل پیش نہیں کر سکتا تھا۔[۶] دوسری عالمی جنگ کے بعد متاثرہ افراد اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکے تھے، اور ذہنی وروحانی مسائل کے ساتھ یادداشت کے فقدان سے بھی دوچار تھے۔ جدیدیت، روشن خیالی کے فلسفہ کے ذریعے انسانوں کو مذہب اور روایت سے آزاد کرتی ہے، مگر اسے عقل اور ٹیکنالوجی کا غلام بنا دیتی ہے۔ اس دوران، مابعد جدیدیت نے جدیدیت کو مختلف شعبوں جیسے فن تعمیر، تھیٹر، سنیما، فلسفہ، نفسیات، اور تاریخ میں چیلنج کرتے ہوئے ابھرنا شروع کیا۔ یہ وہ تحریک ہے جو روایات کی پابندیوں، حکومتی اتھارٹی، اور واحد حقیقت کے نظریات کے خلاف آواز اٹھاتی ہے اور کثرتیت کی حمایت کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کا یہ نقطہ نظر ادب کے میدان میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

مابعد جدیدیت، جدیدیت کے بعد فروغ پانے والی تحریک ہے اور یہ کسی بھی شعبے میں مروجہ اصولوں کو تسلیم نہیں کرتی۔ یہ جدیدیت کے خلاف ایک رد عمل اور بغاوت کی صورت اختیار کرتی ہے۔ جدیدیت کے مطابق حقیقی دنیا صرف اس ٹھوس دنیا تک محدود ہے جس میں ہم رہتے ہیں، جب کے اس کے برعکس مابعد جدیدیت کے مطابق یہ دنیا حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک فرضی دنیا ہے۔ مابعد جدیدیت کے مطابق، کسی تصور یا نظریے کو آفاقی معنوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔۔ جہاں جدیدیت میں سائنس، اخلاقیات، اور فنون کے درمیان ایک ناقابلِ عبور فرق تھا، وہاں مابعد جدیدیت میں یہ فرق اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔

جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی خصوصیات کے حوالے سے بہت سے مختلف مشاہدات پر مبنی متعدد تقابلی جائزے مرتب کیے جا چکے ہیں۔ درج ذیل جدول میں بعض خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

جدیدیت	مابعد جدیدیت
درجہ بندی، نظم وضبط، مرکزیت یافتہ کنٹرول	انارکی، نظم کا خاتمہ، مرکزیت کا خاتمہ
بڑی سیاسی سرمایہ کاری (قوم-ریاست، جماعت)	چھوٹی سیاسی سرمایہ کاری، ادارہ جاتی طاقت کا تصادم، شناختی سیاست
قومی شناخت اور ثقافت کا بیانیہ؛ ثقافتی اور نسلی اصل کے اساطیر	مقامی بیانیے، بڑے بیانیوں کی طنزیہ تحلیل: اصل کے اساطیر کی نفی
سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے بڑے ترقی کے بیانیے	ترقی پر شک کی نگاہ، ٹیکنالوجی مخالف رد عمل، نئے دور کی مذہبی تحریکیں
نمائندوں اور میڈیا کے سامنے "حقیقت" کا یقین اور، "اصلی" دیانت داری	مبالغہ آمیز حقیقت، امیج کی زیادہ مقدار، نقل کا حقیقت سے زیادہ طاقتور ہونا، ایسی چیزوں کی پیشکش جو حقیقت میں موجود نہیں ہیں اور جو موجود چیزوں سے زیادہ طاقتور لگتی ہیں

علم میں مہارت، ہر چیز کا احاطہ: انسائیکلوپیڈیاز	رہنمائی، علم کا انتظام، صرف ضرورت کے وقت معلومات، ویب، انٹرنیٹ
مذہبی ثقافت، عوامی کھپت	ثقافت کا عوامی نہ ہونا (غیر عوامی ثقافت)، چھوٹے بازار، کم پیداوار
میڈیا کی نشریات	ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے والی، صارف کی خدمت کرنے والی میڈیا کی تقسیم، چھوٹے میڈیا کے بڑے پیمانے پر ظاہر ہونے کا عمل (نیٹ ورک اور ویب)
مرکزیت یافتہ علم	تقسیم شدہ، پھیلائی ہوئی معلومات
اعلیٰ اور زیریں ثقافت کا امتیاز؛ اعلیٰ یا رسمی ثقافت کا اصولی اور اتھارٹی پر مبنی ہونا	زیریں مقبول ثقافت کے ذریعے اعلیٰ ثقافت کی اجارہ داری کا ہٹنا؛ مقبول اور اعلیٰ ثقافت کا امتزاج؛ پاپ کلچر کا نئے اقدار حاصل کرنا
مکمل کاموں اور مقصد کا فن ہونا	عمل، پرفارمنس، پیداوار کے طور پر فن
فن؛ فنکار کے ذریعے تخلیق کردہ ایک اصلی شے ہے	فن: سامعین اور ذیلی ثقافتوں کے ذریعے تخلیق کی جانے والی ثقافت کا دوبارہ عمل
عام حدود اور مجموعیت کا احساس (فن، موسیقی اور ادب میں)	مخلوطیت، ثقافتوں کا دوبارہ ایک دوسرے سے جڑنا
نیویارک کی تعمیرات اور ڈیزائن	لاس اینجلس اور لاس ویگاس کی تعمیرات اور ڈیزائن
گہرائی تک پھیلتی ہوئی جڑیں، گہرائی	جڑوں کی سطحی نوعیت، سطحیت
ارادے اور مقصد میں سنجیدگی	کھیل، طنز، رسمی سنجیدگی کے خلاف ردعمل
اتحاد کا احساس، خود کا مرکز ہونا؛ "فردیت پسندی"، متحدہ شناخت	تقسیم کا احساس اور خود کا مرکز نہ ہونا، متنوع اور متنازع شناخت
نامیاتی اور غیر نامیاتی کے درمیان واضح فرق، انسان اور مشین	نامیاتی اور غیر نامیاتی کے مابین سائبرگ امتزاج، انسان-مشین-الیکٹرانک
جنس کی بنیاد پر تشکیل پائے ہوئے طاقت کے نظام، یک جنسیات، فحش کی بے دخلی	دور جنسی، فحش فلمیں
مقرریت	غیر مقرریت

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

دُنیا کے قصہ گو کے طور پر کتاب، تحریری معلومات کے نظام کے طور پر لائبریری تحریری میڈیا کی جسمانی حدود کا تجاوز کرتے ہوئے اعلیٰ میڈیا،	معلوماتی نظام کے طور پر ویب یا نیٹ
مشین	معلومات
ابتدائی	ترقی یافتہ
شے	موضوع
حقیقت (ریئلٹی)	نام سے نہیں تو فعلاً موجود ہونا (ورچوئل)، خیال (امیج)
مادی	معنوی
دلکشی	نفرت انگیزی
قانون	انارکی
مقام	مقام سے محرومی، وقت
گھر	دارالحکومت (میٹروپول)

مابعد جدید ادب کی تفہیم میں زندگی اور موت، حقیقت اور خواب جیسے تضادات ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ متن میں جہاں سب کچھ آپس میں جڑا ہوتا ہے، وہیں مابعد جدید مصنف خود کو ایک مرکزی حیثیت میں رکھتا ہے۔ کسی ایک نقطہ نظر کو قبول کرنے کے بجائے، کثرتیت کو ترجیح دی جاتی ہے، اور افسانوی متن میں کھیل کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، مصنف قاری کو بھی متن کا مرکزی نکتہ بناتا ہے۔Wofgang Iser کے مطابق:

> "کسی ادبی تخلیق کا مفہوم متن میں پہلے سے موجود نہیں ہوتا بلکہ قاری، متن میں موجود چند اشاروں کی بنیاد پر، پڑھنے کے دوران بتدریج اسے تخلیق کرتا ہے۔"(۷)

اس طرح، قاری کو خلا کو پُر کرنے اور کمیوں کو مکمل کرنے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ متن کا مفہوم ہمیشہ تغیر پذیر ہوتا ہے اور اس کی تشریح مکمل طور پر ذاتی سطح پر انجام پاتی ہے۔ مابعد جدید مصنف روایتی ادبی تخلیقات اور ان کے اسالیب کو مسترد کرتا ہے۔ وہ روایتی تکنیک، اسلوب، اور طرز کو ختم کر کے تخیل کے روایتی عناصر کی جگہ مکمل طور پر نئے عناصر پر مبنی ادب تخلیق کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نیا ادب ہے جو مابعد جدید تکنیکوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ، ان تکنیکوں کی الگ الگ عنوانات کے تحت وضاحت کرنا مناسب ہوگا۔

میٹا فکشن (Metafiction)

یہ مابعد جدید تحریروں کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ "مابعد جدید ادب کا بنیادی عنصر میٹا فکشن ہے، جو کہ تخلیقی عمل کو خود افسانوی متن کے اندر تشکیل دینے کا عمل ہے۔ مصنف، اپنی تحریر کو لکھنے کے عمل کو بیان کرتے ہوئے، اس سے جڑے مسائل کو ہی

اپنی تحریر کا بنیادی موضوع بنا دیتا ہے۔"[۸] پوسٹ ماڈرن مصنف قاری کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی تحریر ایک افسانوی کہانی ہے۔

میٹا فکشن نہ صرف افسانے کی بنیادی ساختوں کو آشکار کرتی ہے بلکہ خارجی دنیا کی افسانوی نوعیت کو بھی دریافت کرتی ہے۔ یہ حقیقت اور فکشن کے درمیان تعلق پر سوال اٹھانے والی ایک مصنوعی صورت حال کو اجاگر کرتی ہے۔ ہم میٹا فکشن کو فکشن کے افسانے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس میں سب سے اہم چیز کہانی کے واقعات نہیں بلکہ خود کہانی کی ساخت ہے۔ جیسا کہ Patricia Waugh نے بیان کیا ہے، "اسے کہانی سنانے کے لیے لکھنا بھی کہا جا سکتا ہے۔ میٹا فکشن ایک ایسی اصطلاح ہے جو حقیقت اور فکشن کے درمیان تعلق کو چیلنج کرنے والی فکشنل تحریر سے منسوب کی جاتی ہے۔"[۹]

میٹا فکشن کے مطابق، ایک معروضی دنیا کی وضاحت کرنا ممکن نہیں ہے، کیونکہ حقیقی اور غیر حقیقی عناصر ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ قاری کو حقیقت اور فکشن کے درمیان حد کا احساس دلانے کے لیے وقت، مقام اور واقعات میں ماورائی عناصر شامل کیے جاتے ہیں، اور کہانی کی روایتی زمانی ترتیب کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے غیر خطی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مصنف متن میں مختلف علامات اور خفیہ پیغامات شامل کرتا ہے، جس سے قاری کو متن پر گہری توجہ دینے اور اس کی تشریح کرنے کا موقع ملتا ہے، جبکہ مصنف کو بھی کہانی کے ساتھ کھیلنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ میٹا فکشن کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مصنف خود کو کہانی کا کردار بنا سکتا ہے، کہانی کے اندر ایک اور کہانی بیان کی جا سکتی ہے، یا کسی دوسرے مصنف یا ادبی تخلیق کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح، افسانے کے اندر افسانہ تخلیق کرنا بھی اس تکنیک کی ایک اہم پہچان ہے۔ اس کے علاوہ، کسی پہلے سے موجود متن کو نئے سرے سے ترتیب دینا یا بین المتونیت (Intertextuality) کے ذریعے دیگر حوالہ جات کی طرف اشارے دینا بھی میٹا فکشن کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہے۔

بین المتونیت (Intertextuality)

مابعد جدید تحریروں کی دوسری نمایاں خصوصیت بین المتونیت ہے۔ Ecevit کے مطابق:

> "بین المتونیت میٹا فکشن کی ایک شاخ ہے اور مصنف کے لیے اپنے متن میں تخیلاتی فطرت تخلیق کرنے کا ایک اہم حصہ ہے۔"[۱۰]

بین المتونیت مختلف تحریروں کو اس طرح یکجا کرنے کا عمل ہے کہ وہ ایک دوسرے کو رد نہ کریں اور اپنی تشکیلی سالمیت برقرار رکھیں۔ ہر متن ایک خاص معنی رکھتا ہے، اور قاری ان معنوں کو دریافت کرنے کے لیے پہلے سے موجود تحریروں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس لیے، بین المتونیت کسی ایک تحریر اور دیگر تحریروں کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ تعلق معنوی، اسلوبی یا تشکیلی سطح پر نمایاں ہو سکتا ہے۔

بین المتونیت کی کچھ ذیلی تکنیکیں بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پیروڈی (Parody) ہے، جو "کسی بھی ادبی تخلیق کی نمایاں خصوصیات، مبالغہ آرائی یا نقالی پر مبنی ایک اسلوب ہے، جو کسی سنجیدہ چیز کو مزاحیہ بنا دیتا ہے۔"[۱۱] پیروڈی اصل تخلیق کی تفصیلات کی نقل کرتی ہے، اور ایک موثر پیروڈی تخلیق کرنے کے لیے مصنف کو موجودہ رجحانات سے واقف ہونا، ادبی ذوق رکھنا اور مزاح کی بہتر

سمجھ ہونا ضروری ہے۔ پیروڈی نہ صرف تفریحی عناصر پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ اس میں اصلاحی اور تعلیمی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلسل مقبولیت حاصل کرنے والی ایک سماجی سرگرمی بن چکی ہے۔

بین المتونیت کی ایک اور تکنیک پیسٹیچ (Pastiche) یا نقالی ہے، جو اکثر غلط طور پر پیروڈی (Parody) کے ساتھ منسوب کر دی جاتی ہے۔ دونوں کا مقصد کسی متن کی طرف اشارہ کرنا اور اسے اسلوب یا مواد کے لحاظ سے نقل کرنا ہے۔ تاہم، پیروڈی کسی متن کو مزاحیہ یا طنزیہ انداز میں استعمال کرتی ہے، جبکہ پیسٹیچ صرف ادبی متن کی ساخت پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ Gümüş کے مطابق:

> "پوسٹ ماڈرن ناول نگار پیسٹیچ کو تقلید سے بالکل مختلف محض ایک افسانوی تکنیک کے طور پر دیکھتے ہیں اور اسے روایتی ادب سے انحراف کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔"(۱۲)

پیسٹیچ حقیقت سے دور ہو کر محض تقلید کی طرف مائل ہونے والی ایک فنکارانہ آزادی ہے۔ اس میں اصل تخلیق کو براہ راست شامل نہیں کیا جاتا، اس لیے اسے سمجھنے کے لیے قاری کا اصل تخلیق سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جدید ادب کی پابندیوں کو چیلنج کرنے والا پیسٹیچ، پوسٹ ماڈرن ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔

طنز (Irony) بین المتونیت کی ایک ایسی تکنیک ہے جسے بنیادی طور پر کہی گئی بات کے برعکس معنی دینا سمجھا جا سکتا ہے۔ طنز کسی فرد یا واقعے کا مذاق اڑانے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس میں حقیقت کی نشاندہی تو کی جاتی ہے، مگر اسے چھپا کر اور ایک دانستہ لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش کیا جاتا ہے۔ طنز میں ایک تنقیدی رویہ تو پایا جاتا ہے، لیکن یہ کسی مسئلہ کا واضح حل پیش نہیں کرتی۔ اس کی فطرت میں مسلسل بدلنے والی ایک غیر مستحکم بنیاد ہوتی ہے، جو اسے کسی حتمی جواز سے محروم کر دیتی ہے۔ درحقیقت، یہی چیز اسے تباہ کن، انارکی پسند، اور بعض مواقع پر نہلزم (Nihilism) یعنی فنائیت [۱۳] کے قریب لے آتی ہے، کیونکہ اس میں کوئی مستقل اور مطلق اصول موجود نہیں ہوتا۔ پوسٹ ماڈرن مفکرین کے لیے طنز ایک ایسا عنصر ہے جو ابہام اور تخریبی قوت رکھتا ہے اور جدیدیت (Modernism) کو بے اثر کرنے کا ایک موقع فراہم کرتا ہے۔ طنز، پوسٹ ماڈرن ازم کے ہر پہلو میں نمایاں طور پر موجود ایک طرزِ اظہار ہے۔

تکثیریت (Pluralism)

پوسٹ ماڈرن ازم کی ایک اہم خصوصیت تکثیریت (Pluralism) ہے، جو جدیدیت کے یک جہتی نقطہ نظر کے برعکس، ادب، فن، فلسفہ اور دیگر شعبوں میں تنوع کو یکجا کرنے اور مختلف عناصر کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ حقیقی زندگی اور فن میں مختلف نظریات اور تصورات کو یکجا کرنے کے ساتھ ساتھ یکسانیت سے گریز کرتے ہوئے یہ زندگی کا ایک کثیر الجہتی فلسفہ پیش کرتی ہے جہاں تضادات بغیر کسی امتیاز کے ساتھ موجود رہ سکتے ہیں۔ تکثیریت کا اصول کثیر الثقافتی (Multiculturalism) فلسفہ کو ترجیح دیتا ہے اور مختلف ثقافتوں کے تحفظ کی وکالت کرتا ہے۔ پوسٹ ماڈرن مفکرین کا ماننا ہے کہ ثقافتی بالادستی کے نظریے کو ختم کیا جانا چاہیے۔

لیوٹارڈ (Lyotard) بھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اختلافات کو فعال بنانا چاہئے اور کسی بھی چیز کو واحد مفہوم تک محدود کرنے والے نظریات کو چیلنج کیا جانا چاہیے۔ ان کے مطابق:

"روایتی نظریات کے برعکس، معاشرے کو کسی واحد مربوط ڈھانچے کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اسے مختلف ریشوں سے بنی ہوئی ایک ساخت اور کئی لسانی کھیلوں (Language Games) کے امتزاج کے طور پر سمجھنا چاہیے۔"(۱۴)

پوسٹ ماڈرن ازم "Anything goes"[۱۵] (ہر چیز قابلِ قبول ہے) کے نعرے کے تحت کام کرتا ہے اور سخت سرحدوں اور قطعی اصولوں کو رد کرتا ہے۔ پوسٹ ماڈرن مفکرین زندگی کے ہر پہلو میں کثریت کو اپنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں اور مطلق سچائیوں کے وجود کو مسترد کرتے ہیں۔ پوسٹ ماڈرن ازم میں تکثیریت کا اصول، اعلیٰ درجہ بندی (Hierarchy) کی برتری کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس کا مقصد مساوات قائم کرنا نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اوقات تمام اقدار کی برابری انفرادی قدر کھونے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

بکھراؤ یا تقسیم (Fragmentation)

اگرچہ مابعد جدیدیت کو جدیدیت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ایک ردِ عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے، لیکن یہ جدید ادبی تکنیکوں کی مکمل نفی نہیں کرتا۔ بلکہ، ان تکنیکوں کو ترقی دے کر یا انہیں نئے انداز میں ترتیب دے کر نئے طرزِ تحریر کو متعارف کراتا ہے۔ پوسٹ ماڈرن مصنفین آفاقیت (Universality) کے بجائے بکھری ہوئی ساخت (Fragmentation) کو ترجیح دیتے ہیں اور اس طرح ایک بے قاعدہ نظام تخلیق کرتے ہیں۔ اس طریقہ کار کے ذریعے، وہ دیگر تحریروں سے مختلف عناصر لے کر متنوع اور نئے بیانیے تخلیق کرتے ہیں۔ یہ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ساخت کسی تحریر کو بعض اوقات ناقابلِ فہم بنا سکتی ہے، کیونکہ اس میں کہی گئی بات براہِ راست اور واضح طور پر سامنے نہیں آتی۔ تاہم، پوسٹ ماڈرن مصنفین قاری کی توجہ مختلف قسم کے تحریری اسلوب جیسے کہ شاعری، اخباری مضامین، اور روزنامچوں کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے کام کو دلچسپ اور تفریحی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس انداز کو اپنانے والے مصنفین میں رولان بارتھ (Roland Barthes) کا نام نمایاں ہے۔ بارتھ نے اپنی تحریروں میں بکھری ہوئی تحریر (Fragmented Writing) کو اپنایا،[۱۶] اور ترتیب و تسلسل جیسے اصولوں کو نظر انداز کیا۔ وہ جدیدیت کے مسلط کردہ روایتی اسلوب کے خلاف تھے، اسی لیے انہوں نے اپنی تحریروں میں کسی متعین ترتیب کو قبول کرنے کے بجائے انہیں حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کیا۔ اس عمل کے ذریعے، وہ روایتی تحریری ڈھانچے سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بارتھ کی یہ کوشش ایک منقطع بیانیہ (Disconnected Narrative) تخلیق کرتی ہے، جہاں تحریر کے مختلف حصوں کے درمیان کوئی روایتی ربط موجود نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ ایک منفرد اور غیر روایتی ادبی جمالیات کی شکل میں نکلتا ہے، جو مختلف النوع عناصر کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے۔

زبان(Language)

مابعد جدید بیانیے میں زبان کو حقیقت کی تشکیل اور اظہار کا بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مابعد جدیدیت میں زبان سب سے اہم عنصر ہے، جبکہ اس سے پہلے کے ادبی و فلسفیانہ نظریات میں زبان کو محض ایک ذریعہ کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور اس کو کوئی مقصد نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تاہم، رولان بارتھ، جیک دریدا، پال ڈی مان، اور مشیل فوکو جیسے مفکرین کا کہنا ہے کہ زبان ہی حقیقت کا سرچشمہ ہے اور زبان و حقیقت کے درمیان ایک گہرا تعلق موجود ہے۔ مشہور فلسفی لڈوِگ وٹگنشتائن کے مطابق، زبان میں موجود ہر لفظ کسی نہ کسی شے کی علامت ہے اور زبان اور وہ تمام سرگرمیاں، جن کے ساتھ زبان جُڑی ہوتی ہے، ایک طرح کے 'زبان کے کھیل' کہلاتے ہیں۔[۱۷] پوسٹ ماڈرن مفکر ژاں-فرانسوا لیوتار نے وٹگنشتائن کے اس تصور کو مزید آگے بڑھایا اور کہا کہ زبان کے کھیلوں میں تعدد اور تنوع کو اپنانا چاہیے، کیونکہ یہ ہماری تفہیم کو مزید وسیع اور بامعنی بناتے ہیں۔ پوسٹ ماڈرن ازم میں، زبان کے یہ کھیل نئے بیانیے کی بنیاد رکھتے ہیں اور پرانی روایتی اصطلاحات و تصورات پس پردہ چلے جاتے ہیں۔

زبان کو محدود کرنے کے بجائے اس کی وسعت، تنوع اور تبدیلی کو بنیادی حیثیت دینے والا مابعد جدید نظریہ ادبی تحریروں میں مکمل طور پر جھلکتا ہے۔ Karauğuz کے مطابق:

> "جدیدیت کے لیے زبان ایک اظہار کا ذریعہ تھی، جو تصورات کو حتمی شکل دینے کے لیے استعمال کی جاتی تھی، جبکہ مابعد جدیدیت کے لیے زبان متن کی طاقت کو ظاہر کرتی ہے، تکثیریت کے تناظر میں اس کے استعمال کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے اور حقیقت کی تشکیل میں مدد دیتی ہے۔"[۱۸]

پوسٹ ماڈرن نقطہ نظر سے پہلے زبان کو ہمیشہ ایک ذریعہ سمجھا گیا، اسے کبھی مقصد کے طور پر نہیں دیکھا گیا۔ پوسٹ ماڈرن تحریروں میں بول چال کی زبان، محاورے، ضرب الامثال اور خود ساختہ الفاظ سمیت زبان کے تمام پہلوؤں کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ زبان کو ایک مقصد کے تحت استعمال کرنے والا مصنف قاری کو سوچنے اور محظوظ ہونے کی طرف راغب کرنے کے لیے ہلکے پھلکے اور شوخ انداز میں لکھتا ہے۔ الفاظ کے خوبصورت انتخاب اور عمدہ تشبیہوں کی وجہ سے ناول کی زبان رنگین اور دلچسپ محسوس ہوتی ہے، جبکہ اسلوب کی جدت اور زبان کی سادگی ناول کی دلکشی اور مطالعے کے لطف کو مزید بڑھاتی ہے۔

تاریخ(History)

مابعد جدیدیت تاریخ کے ساتھ اپنے تعلق کو جدیدیت سے مختلف انداز میں بیان کرتا ہے۔ یہ نظریہ اس تصور پر مبنی ہے کہ ماضی کی تفاسیر زبان کے اثر و رسوخ سے تشکیل پاتی ہیں۔ مابعد جدید تحریروں میں تاریخ کو بیک وقت حقیقت اور فکشن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خیالی کرداروں کے ساتھ مشہور تاریخی شخصیات کو یکجا کر کے انہیں فکشنل زندگی کے اندر ایک عام اور معمولی سطح پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح تاریخ کو مصنف ایک تخیلاتی دنیا تخلیق کرنے کے لیے بطور آلہ استعمال کرتا ہے۔ جیمیسن کے مطابق:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

"تاریخ اب ایک مخصوص وقت کے حقیقی تناظر سے نکل کر ہمارے تصورات اور دقیانوسی خیالات کی بنیاد پر ایک 'پاپ-تاریخ' Pop History میں تبدیل ہو چکی ہے، جہاں یہ محض ایک فکشنل کھیل کا میدان بن چکی ہے۔"(۱۹)

پوسٹ ماڈرن تحریروں میں تاریخ ایک کثیر الجہتی اور غیر یقینی عنصر کے طور پر پیش کی جاتی ہے، جہاں وہ اپنی اصل شکل سے ہٹ کر بنیادی تبدیلیوں سے گزرتی ہے۔ تاریخ کی روایتی جامع تفہیم کی جگہ تاریخ کی منتشر اور بکھری ہوئی تفہیم نے لے لی ہے۔ اس تبدیلی میں جدید تکنیکی اور سماجی عوامل کا بھی گہرا اثر ہوتا ہے۔

مابعد جدید تحریروں میں تخلیق کردہ خیالی وقت، ماضی اور حال کو ایک غیر منظم ترتیب میں یکجا کر کے تاریخ کی خطی (linear) ترتیب کو توڑ دیتا ہے اور وقت کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے۔ اس نقطہ نظر میں تاریخ اپنی مکملیت کو کھو دیتی ہے اور ایک جداگانہ تعبیر کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پوسٹ ماڈرنزم تاریخ کے تصور کو ایک سوالیہ نشان کے تحت دیکھتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ماضی، جو مختلف اور پیچیدہ واقعات پر مشتمل ہوتا ہے، کو کسی ایک منفرد نقطہ نظر سے بیان کرنا ممکن نہیں۔

پوسٹ ماڈرن تناظر میں تاریخ کی نئی تعریف پیش کی جاتی ہے جو روایتی تاریخی بیانیے کو رد کرتی ہے اور اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ غیر جانبدار تاریخ کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا، کیونکہ تاریخ ہمیشہ کسی مصنف کے نقطہ نظر کے ذریعے سامنے آتی ہے۔ پوسٹ ماڈرن تاریخی نقطہ نظر کے مطابق، تاریخ محض ماضی کے حقائق کو بیان کرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک متنی (textual) بیانیہ ہے۔ اگرچہ ان تاریخی بیانیوں میں ماضی کو مستند دستاویزات کی بنیاد پر پیش کیا جاتا ہے، لیکن پوسٹ ماڈرنزم اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ ماضی کو مکمل طور پر جانا جا سکتا ہے یا اسے قطعی غیر جانبدار انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق، تاریخ نگار جب ماضی کے واقعات کی وضاحت اور تشریح کرتا ہے تو اس میں اس کی ذاتی سوچ اور نظریہ شامل ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً، اس انداز میں درج کی گئی تاریخی "حقیقتیں" کسی مستقل مزاجی اور سچائی کی حامل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کی صداقت مشکوک ہو جاتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے اثر سے صدیوں سے جاری انسانی طرزِ زندگی اکیسویں صدی کے آغاز میں مکمل طور پر بدل گیا اور یوں صدیوں سے قائم یکسانیت چند سالوں میں اپنی اثر پذیری کھو بیٹھی۔ یہ تبدیلی نہ صرف سماجی زندگی میں بلکہ ادبی رویوں اور نظریات میں بھی نمایاں ہوئی۔ پوسٹ ماڈرنزم بنیادی طور پر جدیدیت پر ایک تنقیدی ردِ عمل کے طور پر ابھرا۔ دیگر فنون کی طرح، یہ ادب کا بھی ایک اہم موضوع بن گیا، خاص طور پر ناول میں، جہاں اس کی کثیر الجہتی ساخت نے مصنفین کو تخلیقی تجربات کرنے کے مواقع فراہم کیے۔

پوسٹ ماڈرنزم ۱۹۶۰ کی دہائی سے لے کر آج تک کے دور پر محیط ہے۔ اس کے نمایاں پہلوؤں میں سرد جنگ اور اس کے بعد کے اثرات، کثیر الثقافتی (multiculturalism) اور نسلی تنوع (ethnic diversity) کا بڑھتا ہوا اثر، اور ٹیکنالوجی، خاص طور پر ٹیلی ویژن اور کمپیوٹرز کے عروج جیسے عوامل شامل ہیں۔ ان واقعات نے نہ صرف سماج بلکہ ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔

پوسٹ ماڈرنزم ثقافتی مطالعے کے دائرے میں فنونِ لطیفہ، تعمیرات، ادب اور فلسفہ جیسے متنوع شعبوں کو محیط کرتا ہے۔ اس لیے اسے کسی ایک مخصوص حوالہ یا تعریف کے تحت محدود کرنا مشکل ہے۔ جیسے جیسے یہ مختلف مباحثوں اور علمی شعبوں میں داخل ہوتا

ہے،اس کے معانی میں مزید باریکیاں پیدا ہوتی ہیں۔پوسٹ ماڈرنزم طبقاتی تفریق کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اعلیٰ اور ادنیٰ فنون کے درمیان قائم سخت سرحدوں کو ختم کرنے کی سعی کرتا ہے۔

پوسٹ ماڈرنزم ایک ثقافتی تصور ہے، جس میں 'post' کا لاحقہ جدیدیت کے بعد ایک نئے ثقافتی عہد کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ عقلیت پسندی اور منطق پر مبنی جدیدیت کے اصولوں کے خلاف ایک چیلنج ہے۔پوسٹ ماڈرن نظریہ عارضی اور تغیر پذیر عناصر کی جستجو کرتا ہے،بجائے اس کے کہ وہ کسی آفاقی سچائی کا پرچار کرے۔اس نظریے کی ایک اور نمایاں خصوصیت روشن خیالی کے اصولوں پر کمزور ہوتے ہوئے یقین کی عکاسی ہے۔فن، تعمیرات، اور ادب کو گہرائی سے متاثر کرنے والے اس تنقیدی اور فلسفیانہ رجحان کے تحت پوسٹ ماڈرنزم ایک ایسا تصور ہے جو تنوع اور اختلاف کو اپنانے کی ترغیب دیتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔یلدز ایجی وِت، ترک ناول میں مابعد جدید رجحانات، ایوریسٹ پبلیکیشنز، استنبول، ۲۰۲۱ء، ص ۴۳

۲۔ سیبل کارادومان، جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک شناخت کی ساختی تبدیلی، ژورنل آف یاشار یونیورسٹی، جلد ۱۷، شمارہ ۲، ص ۲۸۹۰

۳۔یلدز ایجی وِت، ترک ناول میں مابعد جدید رجحانات، ایوریسٹ پبلیکیشنز، استنبول، ۲۰۲۱ء، ص ۴۳

۴۔احمد ملیح کاراؤعوز، نامکمل تعمیر: مابعد جدیدیت، کتابے پبلیکیشنز، استنبول، ۲۰۲۰ء، ص ۲۰

۵۔رابرٹ ینگ، مابعد نو آبادیات: ایک تاریخی تعارف، ترجمہ: بی. توکسبائے کو پرولی اور س. شین، مطبوع کتاب، استنبول، ۲۰۱۶ء، ص ۲۰

۶۔احمد ملیح کاراؤعوز، نامکمل تعمیر: مابعد جدیدیت، کتابے پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۲۰ء، ص ۲۳

۷۔ایضاً، ص ۲۴۱

۹۔شر فنور آتک، بین المتونیّت اور افسانے میں حقیقت پر ایک نظر، بلگے کلچر و آرٹ پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۱۷ء، ص ۳۸

۱۰۔عبداللہ کاراکاش، کالا کتاب کی مافوق القصہ خصوصیات، فرکٹل سہ ماہی ادبی و فکری جریدہ، شمارہ ۲، ص ۸

۱۱۔یلدز ایجی وِت، ترک ناول میں مابعد جدید رجحانات، ایوریسٹ پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۲۱ء، ص ۱۱۴

۱۲۔نیل گوکسل، فراموشی، پیروڈی اور طنز، الیف ایل ایس الیف فلسفہ و سماجی علوم جریدہ، شمارہ ۱، ص ۱۳۵

۱۳۔ سمیح گوموش، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، جان سانات پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۲۱ء، ص ۱۲۰

۱۴۔اکرم گوزل، مابعد جدیدیت، طنز اور فرد کے تعلقات: "تُتونامایان لار" اور "میرا نام سرخ ہے" کے تناظر میں ایک مختصر جائزہ، حکمت۔اکیڈمک ادبیات جریدہ، شمارہ ۱۱، ص ۱۰۶

۱۵۔اُلاش بینگول، مابعد جدیدیت میں کثرتِ آواز اور کثرتِ ثقافت کا مغالطہ، جامعہ دجلہ سوشل سائنسز انسٹیٹیوٹ جریدہ، ۲۰۱۷ء، شمارہ ۹، ص ۴۷

۱۶۔ حکمت شاہین، مابعد جدید فن میں ماخوذ اشیا، ڈاکٹریٹ تھیسس، سلجوق یونیورسٹی ایجوکیشن سائنسز انسٹیٹیوٹ، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۲
۱۷۔ اکوبیلائے آکتولوم، ٹکڑوں میں تقسیم / عدم تسلسل / منقطع، آرٹ-ے سانات جریدہ، ۲۰۰۸ء، جلد ۱، شمارہ ۱، ص ۹-۱۰
۱۸۔ لوڈوگ وِٹگنشتائن، فلسفیانہ تحقیقات، ترجمہ: ایچ. باریشان، میتیس پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۲۰ء، ص ۲۶-۲۸
۱۹۔ احمد ملیح کاراؤعوز، نامکمل تعمیر: مابعد جدیدیت، کتابے پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۲۰ء، ص ۵۰
۲۰۔ یلدز ایجی وِت، ترک ناول میں مابعد جدید رجحانات، ایوریسٹ پبلی کیشنز، استنبول، ۲۰۲۱ء، ص ۷۵

References in Roman Script:

1. Ecevit, Yıldız, Türk Romanında Postmodernist Açılımlar, Everest Yayınları, İstanbul, 2021, s.43
2. Karaduman, Sibel, Modernizmden Postmodernizme Kimliğin Yapısal Dönüşümü, Journal of Yaşar University, 17/2, s.2890
3. Ecevit, Yıldız, Türk Romanında Postmodernist Açılımlar, Everest Yayınları, İstanbul, 2021, s.43
4. Karauğuz, Ahmet Melih, Bitmemiş İnşa: Postmodernizm, Ketebe Yayınları, İstanbul, 2020, s.20
5. Young, Robert, J. Postkolonyalizm:Tarihsel Bir Giriş, Çev. B. Toksabay Köprülü ve S. Şen, Matbu Kitap, İstanbul, 2016, s.20
6. Karauğuz, Ahmet Melih, Bitmemiş İnşa: Postmodernizm, Ketebe Yayınları, İstanbul, 2020, s.23
7. Ibid. p.241
8. Atik, Şerefnur, Metinlerarasılık ve Kurmacada Gerçeklik Üzerine, Bilge Kültür Sanat Yayınları, İstanbul, 2017, p.38
9. Karakaş, Abdullah, Kara Kitap'ın Üst Kurmaca Özellikleri, Fraktal 3 Aylık Edebiyat Düşünce Dergisi, S.2, p.8
10. Ecevit, Yıldız, Türk Romanında Postmodernist Açılımlar, Everest Yayınları, İstanbul, 2021, p.114
11. Göksel, Nil, Unutma, Parodi ve İroni, FLSF Felsefe ve Sosyal Bilimler Dergisi, S.1, p.135
12. Gümüş, Semih, Modernizm ve Postmodernizm, Can Sanat Yayınları, İstanbul, 2021, p.120
13. Güzel, Ekrem, Postmodernizm, İroni ve Birey İlişkisine Tutunamayanlar ve Benim Adım Kırmızı Üzerinden Kısa Bir Bakış, Hikmet-Akademik Edebiyat Dergisi, S.11, p.106
14. Bingöl, Ulaş, Postmodernizmde Çok Seslilik ve Çok Kültürlülük Yanılgısı, Dicle Üniversitesi Sosyal Bilimler Enstitüsü Dergisi, 2017, S.9, p.74
15. Şahin, Hikmet, Postmodern Sanatta Eklektik Nesneler, Doktora Tezi Selçuk Üniversitesi Eğitim Bilimleri Enstitüsü, 2011, p.212
16. Aktulum, Kubilay, Parçalılık/Süreksizlik/Kopukluk, Art-e Sanat Dergisi, 2008, C.1, S.1, p.9-10

17. Wittgenstein, Ludwig, Felsefî Soruşturmalar, Çev. H. Barışcan, Metis Yayınları, İstanbu, 2020, p.26-28
18. Karauğuz, Ahmet Melih, Bitmemiş İnşa: Postmodernizm, Ketebe Yayınları, İstanbu, 2020, p.50
19. Ecevit, Yıldız, Türk Romanında Postmodernist Açılımlar, Everest Yayınları, İstanbu, 2021, p.75

Dr. Aykut Kismir serves as an Associate Professor in the Department of Urdu at Ankara University, Ankara, Turkiye. He completed his PhD at Ankara University, focusing on Urdu fiction and research editing. Dr. Kismir has written four books and published twenty-two articles.

Ms. Zeynep Bozkir is currently pursuing her PhD in the Department of Urdu at Ankara University, Turkiye. She has published one article and holds an MS degree in Urdu Literature from the same university.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 15th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.416

عصریت اور ناول: ناول کی تنقید کا ایک نیا زاویہ

Contemporaneity and the Novel: Toward a New Critical Perspective

DR. KAMRAN ABBAS KAZMI
Assistant Professor, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad, Pakistan.
(kamran.abbas@iiu.edu.pk)

ABSTRACT This article presents contemporaneity as a fundamental critical concept in the critique of the novel. A novel, in its structure, encompasses all aspects of life, such as social, political, economic, and cultural issues, and through it, highlights human psychology and collective consciousness. The novelist, by delving deep into history, politics, and social issues, not only portrays life but also gives it new meaning. Contemporaneity is a modern perspective in novel criticism, through which the novel is evaluated in the context of its time and social environment. This makes it easier to understand the creation of the novel and the critical elements within it. Instead of relying on theoretical concepts, contemporaneity allows for the examination of the novel within its natural context, considering details such as characters, environment, and social influences. In this way, contemporaneity presents the entire process of novel creation in a new light and paves the way for criticism free from theoretical constraints.

Keywords Contemporaneity, Novel, Criticism, Social environment, History.

ناول اپنی ساخت میں ایسا طویل قصہ ہے جو اپنے موضوع کی مناسبت سے عہد کے تمام رجحانات، مسائل بلکہ عصری تنوعات اور ماضی کے اثرات و مستقبل کے امکانات کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ ناول کی تہوں میں لپٹی ہوئی موجود صداقت قلب انسانی کو مائل بہ فکر کرتی ہے اور موجود رویوں میں ناول تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ گویا ناول زندگی کی کئی ابعاد پر محیط ہوتا ہے۔ ناول کسی مخصوص عہد کو بھی موضوع بنا سکتا ہے اور اس میں ایک سے زائد عصر بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان، نے ناول کی جہات اور جہان دگر کی دریافت کو یوں سراہا ہے:

> "اس (ناول) میں ایک سے زیادہ عہد بھی ہو سکتے ہیں، خاص طور پر جو ناول نگار تاریخ کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی کروٹوں کا احاطہ کرتے ہیں وہ ایک طویل عرصے کی حقیقی انسانی نفسیات اور اجتماعی شعور و لاشعور کے حوالے سے پڑھنے والوں کو تحیر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چوں کہ ناول کا فکری کینوس وسیع و عریض ہوتا ہے اس لیے اس میں زندگی کے بڑے بڑے مسائل جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔"(۱)

عالمی ادب کے منظر نامے میں ناول بطور صنف ادب قبولیت اور مقبولیت کا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ناول زندگی

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

کی تمام ابعاد کو محیط ہے گویا ناول اپنے اندر زیست کے تمام امکانات سموئے رکھتا ہے، وہ امکانات بھی جو بظاہر نظر آ رہے ہوتے ہیں اور وہ امکانات بھی جو ابھی مخفی ہوتے ہیں۔ ادبیات اردو اور اصناف ادب کی جانچ پرکھ کے لیے کسی نہ کسی نظریے یا مخصوص فکر کی بندش لازم کر دی گئی ہے۔ کیا اصناف ادب کے لیے لازم ہے کہ وہ کسی خاص مقصد کا پرچار یا پروپیگنڈہ کرے؟ ممکن ہے ایسی اصناف ادب جو زندگی کے تحرک میں سے کسی ایک پہلو یا زاویہ کو مرکز نگاہ بنا رہی ہوں، کوئی مخصوص مقصد اپنے اندر رکھتی ہوں، ان کی جانچ کے لیے تو کسی مخصوص فکری زاویے کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسی اصناف جو زندگی کو بطور مجموعی موضوع بنا رہی ہوں کیا ان کے لیے لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ کسی خاص نظریے کی عکاس ہو کر رہ جائیں؟ اگر کوئی صنف ادب کسی خاص نظریے کی ترویج تک محدود ہو جائے گی تو عین ممکن ہے کہ اس کی ادبیت مجروح ہو جائے۔ مثلاً غزل کا کوئی شعر یا افسانہ چونکہ زندگی کی گوناگوں تہہ داری اور کلیت میں سے محض ایک زاویے کو موضوع بناتے ہیں اس لیے وہ زاویہ نظر کسی مخصوص فکر سے مملو یا نظریے کا حامل ہو سکتا ہے۔ گو کہ معنی کی تکثیریت اس شعر یا افسانے میں تہہ داری پیدا کیے رکھتی ہے پھر بھی مثلاً فیض کو پڑھتے ہوئے یہ احساس موجود رہے گا کہ ان کا شعر ترقی پسند افکار کے زیر اثر ہے۔ منٹو کے افسانے تلخ سماجی حقیقتوں کے اظہار کے حوالے سے ترقی پسندانہ خیالات کے حامل سمجھے جائیں گے لیکن ناول زندگی کی ہمہ گیریت کو موضوع بناتا ہے یا اسے بنانا چاہیے اور وہ انسانی زندگی یا قاری جو زندگی بتا رہا ہے اس زندگی کی کلیت پر اثر انداز ہوتا ہے اس لیے ناول کے لیے بھی کیا ضروری ہو گا کہ وہ کسی مخصوص فکر کا آئینہ دار ہو؟ ناول کے پھیلاؤ پر بات کرتے ہوئے قمر جمیل لکھتے ہیں:

> "اچھا ناول ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے اور اس حیرت سے ہمیں ایک مسرت بھی حاصل ہوتی ہے اور یہی نہیں، ناول سے ہمیں زندگی کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ہم ناول پڑھنے کے بعد زندگی اور اس کے مسئلوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگتے ہیں۔"(۲)

درج بالا اقتباس میں مصنف نے ناول کی اہمیت ہی نہیں اس کے مصنف کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یعنی محض زندگی کو سمجھنا ہی نہیں بلکہ بسر کی جانے والی حقیقی زندگی کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنا بھی ناول کے لیے لازم ہے۔ ناول میں زندگی کی اقدار کسی نہ کسی صورت جنم لیتی ہیں اور وقوعے کو ارتقا کی طرف لے جاتے ہوئے اپنی تفہیم بھی کراتی ہیں۔ ظاہراً یہ سارا عمل فن کار کے تخلیقی عمل کا بھی محتاج ہوتا ہے۔ یہاں فن کار کے تخلیقی شعور اور مشاہدے کو بھی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے کہ فن کار از خود کیا دیکھنا چاہتا ہے۔ ناول نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کو برت رہا ہوتا ہے یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک پہلو زیادہ اہمیت اختیار کر جائے اور باقیوں کی نقوش مدھم ٹھہریں تاہم ناول مکمل زندگی کا احاطہ کسی نہ کسی طور پر کرتا ہے۔ جیسا کہ مصنفین ناول کیا ہے؟ لکھتے ہیں:

> "ناول میں زندگی کا نقشہ نہیں بلکہ زندگی کی نئے سرے سے تخلیق ملتی ہے، یہ زندگی کو اس طرح خلق کرتی ہے کہ جو چیز زندگی میں موجود نہیں ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جاتی ہے اس چیز کو ہم تشریح، فیصلہ، اشارہ یا قدر کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ وہ چیز ہے جو ناول کے لیے ذریعہ ظاہر ہونے والی زندگی کو ایک خاص معنی اور اہمیت دے دیتی ہے۔"(۳)

ناول اور زندگی کی عکاسی سے متعلق مباحث آئندہ صفحات میں آئیں گے یہاں فقط ناول کے اجزا کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ ناول کے لیے قصہ، کردار، ماحول اور پیش کش اہم ہیں۔ قصہ اس کی بنیادی ضرورت ہے لیکن وہ کرداروں کے ذریعے روبہ عمل آتا ہے اور کردار کسی خاص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اور پیش کش دراصل فن کار کا فن ہے یا سلیقہ ہے جو وہ ماجرا کہتے ہوئے برتتا ہے۔ ناول اگر زندگی کی جہات اپنے اندر تخلیقی سطح پر سمو کر نہیں لاتا تو وہ ادبیت کے دائرے سے نکل جائے گا۔ جیسا کہ سید محمد عقیل نے وضاحت کی ہے:

> "اگر ان سب میں (قصہ، کردار، ماحول اور پیش کش) زندگی کے تقاضے، نئی قدریں، ان کے برتنے کا سلیقہ، مختلف الجہاتی حقیقتوں کا ادراک، ان سے قربت اور پھر فنی تخلیقیت نہ ہو تو قصہ اور اس میں بیان کیے ہوئے واقعات، سب اپنی ادبی حیثیت اور حقیقت کھو دیتے ہیں۔"(۴)

ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے لیکن اس کی پہلی شرط ادبیت ہے۔ ماہرین علم انسانیات کا خیال ہے کہ ادب ابتدائی انسان کی رسوم سے فروغ پذیر ہوا اور یہ رسوم از خود فرد کی زندگی اور اس کے جمالیاتی تجربے سے پھوٹتی ہیں بلکہ زندگی کی جمالیات کو بڑھانے کی عامل ہوتی ہیں۔ گویا ادب سماجی تبدیلی کے محرکات کو نہ صرف منعکس کرتا ہے بلکہ اس تبدیلی کے عمل میں شریک کار بھی ہوتا ہے۔ یہاں نظریہ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے یعنی آنے والی تبدیلی کی کوئی خاص سمت ہوگی یا سماج میں تغیر پیدا کرنے والے عوامل کوئی مخصوص تبدیلی چاہتے ہوں گے تو ایسے میں نظریے کی آمریت سے گلو خلاصی ممکن نہیں رہتی۔ البتہ ادب یا فن کی بنیادی ماہیت اس تبدیلی کے امکانات کو آزمانے میں پوشیدہ ہے جس کے نتیجے میں فرد کی زندگی پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ صدیق کلیم "ادب اور مقصدیت" کے ذیل میں فن کی اہمیت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بہر حال فن کی حقیقی ماہیت اسی میں ہے کہ وہ نہ صرف ہماری روحانی زندگی کو بلکہ ہماری روزمرہ کی مادی زندگی کو بھی تقویت بخشتا ہے، جلا دیتا ہے اور آگے بڑھاتا ہے۔ فن کار کا تجربہ اپنی ماہیت میں ذاتی خواہش سے پیدا ہوتا ہے اور ایسے ہی مبصرین کا بھی، لیکن یہی تجربہ بیک وقت تخیلی ہونے کے باوصف ہماری تمام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایسے اپنی شہرت اور ہمہ گیریت کے سبب ہماری روزمرہ زندگی کے لیے شخصیت کی تمام سطحوں پر موثر ثابت ہوتا ہے۔"(۵)

ادب اور اس کے مقاصد سر دست موضوع نہیں ہیں لیکن ادب کا مفصل اظہار چونکہ ناول میں ہوتا ہے تو یہ دیکھنا مقصود ہے کہ کیا ناول ہر صورت میں مقصدی ہونا چاہیے؟ حظ یا انبساط کا حصول بھی تو ادب کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ لیکن شار حین ادب نے ادب کے لیے کسی اخلاقی جواز کو لازمی قرار دیا ہے، جیسا کہ شہزاد منظر کے ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:

> "ادب کا مقصد جب تخلیق کی مسرت، تزکیہ نفس اور حیات و کائنات کی تعبیر و تفہیم ہو تو مصنف کا زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں ایک مخصوص نظریے کا ہونا اور بھی ضروری ہو جاتا

ہے۔۔۔ادب عالیہ کی تخلیق کے لیے مصنف کا زندگی کے بارے میں مخصوص نقطہ نظر بہ الفاظ دیگر نظریہ حیات رکھنا۔۔۔ دنیا میں آج تک نظریہ حیات کے بغیر کوئی اعلیٰ ادب تخلیق نہیں ہوا۔"(۶)

ادیب کے نظریہ حیات کی بات درست سہی لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی بذات خود کوئی مخصوص زاویہ نظر رکھتی ہے؟ کیا زندگی کو محض اجزا میں منقسم کر کے دیکھا جائے؟ یا اس کی کوئی کلیت ہے؟ کیا ادیب کے لیے زندگی سے وابستہ ہونا کوئی نظریہ کہلائے گا یا کسی مخصوص آدرش جیسے، جدیدیت، ترقی پسندی، اشتراکیت، سرمایہ داری وغیرہ سے وابستگی سے ہی اس کا نظریہ حیات تشکیل پائے گا؟ راقم کا خیال ہے کہ ادب چونکہ بقول آرنلڈ "تنقید حیات" ہے تو نظریہ حیات بھی زندگی کی اجتماعیت سے کشید ہو گا اسے کسی مخصوص ازم،(Ism) کی عینک سے نہیں دیکھا جاسکتا۔ اس مؤقف کی تائید مزید سید محمد عقیل کے اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے:

"انسانی سوسائٹی نے جو کچھ بھی کارنامے انجام دیئے ہیں یا جن کے انسان خواہش مند ہیں یا جو کمیاں اس سماج میں رہی ہیں یا ہیں، ان کی نشاندہی کر کے، ان سے نپٹنے کی تمنا اور پھر ایک اچھی سوسائٹی کی تشکیل، جو استحصال اور جبر سے پاک ہو اور ایک آزاد فضا میں، انسانوں کو بڑھنے پھیلنے کے مواقع ہاتھ آئیں۔ یہی تو ناول نگار کا نارمل مقصد حیات ہو سکتا ہے۔ عظیم ناول نگار سوسائٹی کی تہوں میں ڈوب کر اس کرب، ان کمیوں اور تمناؤں کو تلاش کرتا ہے جو حیات انسانی کو ایک نیا شعور ایک نئی تعین سمت(Orientation) اور وژن عطا کریں۔ لیکن اگر کسی ناول نگار کی تخلیق میں ایسے مسائل یا حقیقتوں کا ادراک نہیں تو پھر ناول اور بیانیہ سطحی اور محض سستی لذت کے مظہر بنتے ہیں۔"(۷)

سید محمد عقیل نے "نظریہ حیات" کی درست تشخیص کی ہے۔ گویا نظریہ حیات کا قطعاً مقصد کسی خاص 'ازم' کی جگالی کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر زندگی کی مجموعی کیفیت کو گرفت میں لینا ہے۔ ممکن ہے اور یقیناً ایسا ہے کہ ناول نگار زندگی کے کسی مخصوص نصب العین کو ہی زندگی کے آلام و مصائب کم کرنے اور اسے خوش حال بنانے کے لیے ضروری خیال کرتا ہو لیکن تخلیق ناول میں دیگر کئی پہلو خود بخود ہمراہ چلے آتے ہیں۔ مثلاً "لندن کی ایک رات" کے مصنف سجاد ظہیر ترقی پسند خیالات کے شدت سے حامی تھے مگر کیا ناول پر محض مارکسی، اشتراکی، حقیقت نگاری یا ترقی پسندی کے اثرات ہیں؟ کیا اس ناول میں کرداروں کی نفسیاتی دروں بینی، نو آبادیاتی کشمکش، جدید زندگی کے مسائل، مذہب اور اس کے اثرات، محبت، حقارت، رقابت، جنسی مسائل، شعور و لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے گرہیں اور ایسے زندگی سے متعلق دیگر کئی تصورات در نہیں آئے؟ اور اب اگر ناول کا مطالعہ محض ترقی پسند افکار کی روشنی میں کیا جائے گا تو کیا ناول کی تمام جہات قاری پر منکشف ہو سکیں گی؟ اور کیا خود ناول نگار کا مقصد فقط یہ تھا کہ ایک ایسے کردار کی ذہنی الجھنیں محض حقیقت نگاری کے راستے بیان کی جائیں جو ہندوستان کی زندگی اور اپنے آقاؤں کے وطن کی زندگی میں محسوس کر رہا ہے؟ یقیناً ایسا نہیں ہے تو ناول کو پرکھنے، تجزیہ فن کرنے، ماجرا کی گرہیں کھولنے، قصہ کے داخلی و خارجی عوامل کا جائزہ لینے، کرداروں کی کشمکش کو سمجھنے اور ماحول

کو جاننے، معاشرت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے دیگر پیمانے وضع کرنا پڑیں گے اور پہلے سے وضع شدہ پیمانوں کو کارنس پر سجانا ہو گا۔ ناول کی تمام گرہوں کی نقاب کشائی، تجزیہ اور تنقید کے لیے "عصریت" ہی ایسا پیمانہ ہے جو تنقید ناول کے نئے روزن وا کر سکتی ہے۔ کیونکہ ناول زندگی کو اس کی تمام جزئیات سمیت زیر بحث لاتا ہے اس لیے اسے پرکھنے کے لیے بھی ایک وسیع زاویہ نظر درکار ہو گا:

> "ناول میں انسان اور اس کا معاشرہ اور اس کی کائنات اپنی سچی اور باطنی روشنی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایسی روشنی میں جس میں دوسروں کے ساتھ انسان کا اپنا تعلق ظاہر ہوتا ہے، ناول میں کوئی نیا خیال یا زندگی کا کوئی نیا پہلو ضرور پیش کیا جاتا ہے، جن قوتوں سے دنیا کی تعمیر اور تخریب ہوتی ہے ناول نگار ان قوتوں کے پس منظر میں انسان اور اس کے معاشرے کو دیکھتا ہے اور ان چھپی ہوئی حقیقتوں کو پیش کرتا ہے جو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں نہیں دیکھتے۔"(۸)

عصریت (Contemporaneity) ہی ایسا زاویہ نظر ہے جو ناول میں موجود تعمیر اور تخریب کی قوتوں اور ان کے عوامل کا ادراک کر سکتا ہے۔ کیوں کہ جب ناول پر کوئی نظریہ لاد دیا جائے تو وہ ناول نہیں رہے گا بلکہ پارٹی منشور بن جائے گا، گویا ناول کی تنقید کو نظریاتی جکڑ بندی بلکہ نظریے کی آمریت سے آزاد ہونا چاہیے اس لیے بھی "عصریت" (Contemporaneity) بطور تنقیدی زاویہ ناول میں برتا جانا چاہیے۔ عصریت کیا ہے؟ جب سماج کے تمام محرکات کا جائزہ لیا جائے گویا ایک سماج کے عصر، تاریخ، سیاست، معاشرت، معیشت، جغرافیائی ماحول، عالمی صورتحال، مذہب، تہذیب، نفسیاتی عوامل اور ایسے دیگر محرکات جو سماج پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں، کا جائزہ لیا جائے اور ان کی تفہیم کے بعد ان کی روشنی میں ناول کو پرکھا جائے تو یہ عصریتی تنقیدی مزاج کہلائے گا۔ مثلاً "اداس نسلیں" ناول کا زمانہ ۱۸۵۷ء سے آغاز ہو کر ۱۹۴۷ء کے آس پاس ختم ہوتا ہے، اب اس عہد میں آنے والی تبدیلیاں، سیاسی حالات، عالمی جنگوں کے مسائل اور ان کے اثرات، تحریک آزادی، صنعتی بے روزگاری اور پھر مشینی عہد کا آغاز اور اس کے مسائل، سماجی شعور، تاریخی شعور، تہذیبی و ثقافتی عوامل، مذہب اور جدید علوم کے ٹکراؤ کے نتائج، تقسیم، فسادات، ہجرت اور ان سب کے سماجی، ثقافتی اور بالخصوص نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے ناول کا تجزیہ کیا جائے تو وہ عصری تنقیدی زاویہ ہو گا یا اس تجزیاتی عمل کو عصریت (Contemporaneity) کہا جائے گا۔

عصریت مزاج تنقید کا ماحول اور مسالہ خود ناول کے اندر سے دریافت ہو گا۔ مثلاً ناول میں برتا جانے والا زمانہ، تہذیب، فکری تصورات، کرداروں کا سماجی ماحول اور نفسیاتی محرکات، قومی و بین الاقوامی سیاست، علوم اور ان کے اثرات از خود ناول کے لیے تنقیدی راستے مہیا کر دیں گے۔ یوں ناول کو نظریے کی آمریت سے نکل کر جانچنا اور اس کا تجزیہ کرنا اور اس کے ذریعے کسی خاص عصر کی معلومات یا تاریخ اخذ کرنا سہل ہو جائے گا۔

ناول کو بالعموم زندگی کی تصویر یا حقیقی عکاسی کہا جاتا ہے لیکن اگر دنیا کے بڑے ناولوں جیسے "جنگ اور امن" یا "کرامازوف برادران" وغیرہ کا بھی جائزہ لیں تو زندگی اور ناول کی پیش کردہ زندگی میں فرق نظر آئے گا تو ایسی صورت میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ نظریے کی آہنی دیوار توڑ کر ناول کو جانچا جائے؟ زندگی اور ناول کی زندگی میں موجود امتیاز کو ڈاکٹر عبدالسلام نے یوں واضح کیا ہے:

"ناول والی زندگی مرتب اور منظم ہوتی ہے۔ اس کے مختلف واقعات کے مابین ایک رشتہ پایا جاتا ہے۔ عموماً یہ رشتہ علیت کا ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی کے مختلف واقعات کے مابین کسی رشتہ کا پایا جانا ضروری نہیں۔ حقیقی زندگی میں یہ ضروری نہیں ہے کہ افراد زندگی کے مختلف امور کے بارے میں واضح نقطہ نظر رکھتے ہوں۔ ان کی زندگی گزارنے کے کچھ اصول ہوں۔ ان کے عمل کے ساتھ کوئی قدر وابستہ ہو۔ یہ زندگی بے ہنگم اور غیر مربوط ہوتی ہے یہاں واقعات اکثر اتفاقات کی پیداوار ہوتے ہیں۔"(۹)

یعنی ناول زندگی کی بارد گر تخلیق ہے۔ یہی بات احسن فاروقی نے بھی کی ہے:

"ناول اہم ترین فن ہے جو نثر کی ہر صنف کو اپنے اندر لے لیتا ہے اور ہر صنف پر حاوی ہوتا ہے یہ بات بھی ضروری ہے کہ یہ فن ہے، یعنی زندگی کی محض ترجمانی بلکہ زندگی کی ایک اہم فرد کی نظر کے مطابق تخلیق ہے۔"(۱۰)

درج بالا دونوں اقتباسات زندگی کی بارد گر تخلیق کو ناول کا منصب خیال کرتے ہیں۔ عصریت کے تنقیدی زاویے کو یہ امر مزید سہولت بہم پہنچاتا ہے کیونکہ زندگی جیسی ہے ویسی پیش کر دینے سے جامد عکاسی (Still Photography) کا تصور ابھرتا ہے اور نقل کی نقل کے تصور کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے جبکہ بقول ارسطو تخلیق ادب میں ایک شے زائد ہوتی ہے جو اسے اعلیٰ ادب کا حصہ بناتی ہے اس طرح وہ محض نقل نہیں رہ جاتا۔ عصریت اسی شے زائد کے محرکات و عوامل تلاش کرتی ہے اور ان کے ذریعے ناول کی پیش کردہ زندگی کو جانچتی ہے۔ یہیں ایک اور پہلو کا جائزہ لینے کے بعد عصریت تنقیدی زاویے کا محاکمہ کیا جاسکے گا اور وہ پہلو تخلیق کار کا کسی خاص نظریے سے اپنی وابستگی کا اظہار ہے۔ شہزاد منظر نے اس کی توجیح یوں کی ہے:

"ہر شخص کے لیے خواہ وہ ادیب ہو یا شاعر، حقیقت کو اپنے طور پر سمجھنا اور اس کی تہہ تک پہنچ کر نظریہ وضع کرنا ممکن نہیں ہے اسی لیے عام لوگ (جن میں ادیب و شاعر بھی شامل ہیں) زندگی کے بارے میں کسی نہ کسی مروجہ نظریے کو قبول کر لیتے ہیں اور اس نظریے کی اور اپنے عملی تجربات کی روشنی میں حقیقت کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر کوئی ادیب اپنی صوابدید کے مطابق کسی مروجہ نظریے کو قبول کر کے اسے اپنی تخلیقات میں خوبصورتی اور فن کارانہ چابک دستی سے پیش کرتا ہے تو اس میں عیب کیا ہے؟"(۱۱)

یقیناً فن کار اگر اپنا کوئی مخصوص یا پہلے سے وضع کردہ نقطہ نظر اپنا لیتا ہے تو اس میں کوئی فنی عیب نہیں ہے البتہ اس سے زندگی کو کسی خاص یا پابند زاویہ نظر سے دیکھنے اور اسے ہی حتمی سمجھنے کا رویہ یا "عیب" پیدا ہو جائے گا۔ یہاں "ادب کی موت" کے بعد "نظریے کی موت" کا اعلان کرنا مقصود نہیں گو کہ مابعد جدید مباحث نے اپنی منہاج میں یہی فریضہ انجام دے دیا ہے، فقط اس امر کی

وضاحت مقصود ہے کہ کسی خاص نظریے کی چھڑی سے ہانکنے سے تخلیق کار مبلغ اور مصلح کے درجے پر جا پہنچے گا۔ ویسے بھی نظریہ ایک ایسی کسوٹی بنانے پر زور دیتا ہے جس میں فن پارے کو کس کر دیکھنے سے نقاد اس کے متعلق منفی یا مثبت فیصلہ صادر کرنے پر مجبور ہو گا اور اس کا یہ فیصلہ اضافی حیثیت اختیار کر جائے گا۔ ہمارے ادب میں تو ویسے ہی تنقیدی نظریات مستعار ہیں اور ان کے ہمارے سماجی ماحول سے مطابقت کے پہلو ہنوز وضاحت طلب ہیں۔ نظریاتی تنقید کے نقصانات گنواتے ہوئے ایک اہم پہلو کی طرف ڈاکٹر انور سدید یوں توجہ دلاتے ہیں:

> "نظریاتی تنقید۔۔۔نے نقاد کو کسی حد تک متعصب بنا کر اسے جانبداری کا شکار بھی کیا ہے۔ اس قسم کی تنقید میں چونکہ نقاد کا ایمان نظریے پر زیادہ پختہ ہوتا ہے اس لیے وہ بہر لحاظ نظریے کی صداقت اور فوقیت کو ثابت کرنے پر ہی سارا زور بیان صرف کر ڈالتا ہے اور اکثر فن پارے کے محاسن و معائب ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔۔۔ نظریاتی تنقید کی شدت اور قطعیت نے زبان کی لطافت کو بھی مجروح کیا ہے اور ادب کے مباحث میں ایک خشک اور بے رنگ اسلوب کو فروغ دیا ہے۔"(۱۲)

گویا عصریت سے ہی یہ ممکن ہے کہ نظریے کی شدت کو ایک طرف کر کے ادب کا مطالعہ اس کے ماحول، سماجی شعور، عصری شعور، آفاقی اقدار، تاریخی عمل کی روشنی میں کیا جائے۔ یوں نقاد تخلیق کار کا رہنما نہیں بنے گا بلکہ اس کا شارح رہے گا۔ کیونکہ نقاد کے ذمہ بقول میتھیو آرنلڈ سماج کے اہم رجحانات کا سراغ لگانا ہوتا ہے اور انہیں رواج دینا بھی اس کے منصبی فرائض میں شامل ہے۔ یوں کوئی بھی نظریہ اگر روبہ عمل ہو گا تو وہ ادیب کو آزادی اظہار کی زیادہ اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ جو ادب اس مخصوص نظریے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترے گا وہ ادب نہیں ہو گا۔

آج کے اس بین الاقوامیت کے عہد میں نظریہ سازی اہم بھی نہیں رہی۔ نئی نئی ایجادات انسانی تصورات کو پل پل بدلے دیئے جا رہی ہیں۔ سو اب ادیب سے یہ توقع کرنا کہ وہ کسی ایک نظریے کے کھونٹے سے بندھا رہے عبث ہے۔ یہی صورتحال نقاد کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ سو بھی عصریت ناول کو پرکھنے کا بہترین تنقیدی آلہ یا زاویہ ہے۔ ادب تطہیر نفس یا تزکیہ نفس کا بھی ذریعہ ہے سو ادیب کا مصلح بن جانا بھی عیب نہیں تو یہ واضح رہے کہ محض تبلیغ یا محض اصلاح ادبیت کو نقصان پہنچاتی ہے اس لیے ناول جیسی صنف کا احاطہ کرتے ہوئے رائج ادبی نظریات کے ساتھ ساتھ ناول کے اپنے اندر موجود ماحول اور کشمکش سے بھی تنقیدی اصول وضع کیے جاسکتے ہیں اور یہی عصریت ہے ورنہ کسی خاص نظریے سے ادبی تخلیقات کو پرکھنے کی صورت میں کئی غلط مباحث جنم لیں گے۔ مثلاً ترقی پسند نظریہ ادب ایسے ہر ادب کو متروک قرار دینے پر زور دے گا جو اس کے منشور کے مطابق نہیں ہو گا۔ گویا ادب کو محض اقتصادی مسائل اور طبقاتی کشمکش کو موضوع بنانا چاہیے۔ جیسے سرمایہ داریت میں انسانی شعور کا بڑا حصہ زندگی کی جدوجہد یعنی زندہ رہنے کی تگ و دو پر مرتکز رہتا ہے اور نفسیاتی عوامل محض فرد کی مجہول حرکات کے تجزیے تک محدود ہو جاتے ہیں اور جدیدیت فرد کی نفسی الجھنوں کی پیش کش سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یوں ادب کی تفہیم میں دشواریاں پیدا ہوں گی۔ عصریت ایسا نقطہ نظر ہے جو ان دشواریوں کو ہموار راستہ مہیا کرتا ہے اور

نظریے کی آمریت اور جکڑبندی سے ناول کو نکال کر آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ فرد یا قوم کے ذہنی عوامل کا تعین فقط ذرائع پیداوار نہیں کرتے اس کا ماحول، تہذیب، نفسیاتی محرکات، تاریخی اثرات بھی اہمیت رکھتے ہیں اور عصریت ناول کو اس کے ماحول، اس میں پیش کی گئی ثقافت، تہذیب، تاریخ، مذہب، طبعی عوامل وغیرہ کے ساتھ پرکھتی ہے۔ کوئی بھی فنکار اپنے جذبات و احساسات کا مکمل یا ارفع اظہار اسی وقت کر سکے گا جب وہ اپنی آہنی شخصیت کا خول توڑ کر نکلے گا اور معاشرے کے ساتھ باہمی موافقت کا رشتہ استوار کر لے گا۔ یہی عمل نقاد کے لیے بھی ضروری ہے کیونکہ وہ تو بقول ایلیٹ تخلیق کی بازیافت کر رہا ہوتا ہے۔ ناول کسی سماج کی تاریخ، تہذیب، سماجی ماحول اور دیگر فکری و طبعی عوامل کا عکاس ہوتا ہے بلکہ نقاد بھی ہوتا ہے اور انہیں محفوظ بھی بناتا ہے۔ اگرچہ کسی سماج کے اجتماعی یا انفرادی تخیل کی بلند پروازی کا اندازہ اس کی شاعری سے ہوتا ہے مگر اس سماج کی تہذیبی روح اس کے فکشن بالخصوص ناول سے جھلکتی ہے۔ سماج میں بدلاؤ کیسے پیدا ہو رہا ہے، کون سے عوامل اس تغیر کا سبب بن رہے ہیں، سائنسی اثرات کیسے اور کیونکر مرتب رہے ہیں، طبقاتی آویزش کیا رخ اختیار کرنے والی ہے، سیاسی شعور اور بلوغت کی سطح اور جدید سرمایہ داری و صنعتی تمدن اخلاقیات کے کون سے ضابطے متعین کر رہا ہے؟ ان سب عناصر کی تصویر ناول میں ملتی ہے اور ان کی تعبیر و تشریح کے لیے عصریت ہی ایسا تنقیدی زاویہ ہے جو ان سب عوامل کو اپنے احاطہ میں سمو سکتی ہے۔ تاہم پھر بھی آئندہ کے لیے ایک نیا سوال زیر بحث آ سکتا ہے کہ عصریت ہی کسی نئے نظریے کا روپ دھار کر خود نظریے کی آمریت کا شکار نہ ہو جائے۔ اس امکان کو کھلا رکھنا ہی مناسب رویہ ہو گا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، ماجرا سرائے پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت اول، ۲۰۰۸ء، ص ۲۳۷

۲۔ قمر جمیل، ناول کی سچوئیشن، ایک جائزہ، مشمولہ: ماہنامہ "سیپ"، شمارہ ۵۳، ستمبر-اکتوبر ۱۹۸۸ء، مدیر: نسیم درانی سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۴۲

۳۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، سید نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے؟ دردا کادمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۴۹

۴۔ محمد عقیل، سید، جدید ناول کا فن (اردو ناول کے تناظر میں) نیا سفر پبلی کیشنز، الہ آباد (انڈیا)، نومبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۷

۵۔ صدیق کلیم، فکر سخن، مجلس ترقی ادب، لاہور، اشاعت اول، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۰

۶۔ شہزاد منظر، ردعمل (تنقید)، منظر پبلی کیشنز، کراچی، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ص ۹۴

۷۔ محمد عقیل، سید، جدید ناول کا فن، (اُردو ناول کے تناظر میں)، ص ۳۴

۸۔ قمر جمیل، ناول کی سچوئیشن، ایک جائزہ، مشمولہ: سیپ، شمارہ ۴۷، جولائی، اگست، ۱۹۸۴ء مدیر: نسیم درانی، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ص ۱۴۴

۹۔ عبد السلام، ڈاکٹر، فن ناول نگاری، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص ۳۳

۱۰۔ احسن فاروقی، ڈاکٹر، ادبی تخلیق اور ناول، مکتبہ اسلوب، کراچی، طبع اول، ۱۹۶۳ء، ص ۲۱

۱۱۔ شہزاد منظر، ردِ عمل (تنقید)، ص۹۹

۱۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، مباحثہ، مشمولہ: سوال یہ ہے، مرتبہ: نوشی انجم، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۴ء، ص۳۰۹

References in Roman Script:

1. Mumtaz Ahmad Khan, Dr., *Urdu Novel ke Hama Geer Sarokar*, Majra Sarai Publications, Karachi, Asha'at-e-Awwal, 2008, p.237
2. Qamar Jameel, *Novel ki Situation: Ek Jaiza*, Mashmoola: Mahnama "Saip", Shumara 53, September-October 1988, Mudeer: Naseem Durrani, Saip Publications, Karachi, p.142
3. Muhammad Ahsan Farooqi, Dr., Syed Noor-ul-Hasan Hashmi, Dr., *Novel Kya Hai?*, Dard Academy, Lahore, 1964, p.49
4. Muhammad Aqeel, Syed, *Jadeed Novel ka Fun (Urdu Novel ke Tanazur mein)*, Naya Safar Publications, Allahabad (India), November 1997, p.17
5. Siddiq Kaleem, *Fikr-o-Sukhan*, Majlis Taraqqi Adab, Lahore, Asha'at-e-Awwal, 2008, p.210
6. Shehzad Manzar, *Rad-e-Amal (Tanqeed)*, Manzar Publications, Karachi, Taba' Awwal, 1985, p.94
7. Muhammad Aqeel, Syed, *Jadeed Novel ka Fun (Urdu Novel ke Tanazur mein)*, p.34
8. Qamar Jameel, *Novel ki Situation: Ek Jaiza*, Mashmoola: *Saip*, Shumara 47, July-August 1984, Mudeer: Naseem Durrani, Saip Publications, Karachi, p.144
9. Abdul Salam, Dr., *Fun-e-Novel Nigari*, Urdu Academy Sindh, Karachi, Taba' Awwal, 1999, p.33
10. Ahsan Farooqi, Dr., *Adabi Takhleeq aur Novel*, Maktaba Asloob, Karachi, Taba' Awwal, 1963, p.21
11. Shehzad Manzar, *Rad-e-Amal (Tanqeed)*, p.99
12. Anwar Sadeed, Dr., *Mubahisa*, Mashmoola: *Sawal Ye Hai*, Murattiba: Noshi Anjum, Beacon Books, Multan, 2004, p.309

Dr. Kamran Abbas Kazmi is an Assistant Professor in the Department of Urdu at the International Islamic University, Islamabad, Pakistan. He is also currently serving as the Chairman of the Urdu Department at the same university. Dr. Kazmi earned his PhD from the Federal Urdu University of Arts, Sciences & Technology, Islamabad, with a specialization in Urdu fiction and poetry. He has authored one book and published fifteen articles.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 18th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.411

ناصر عباس نیر کے افسانوں کی تحلیل: بیانیہ، فکر اور موضوعاتی جہات

An Analysis of Nasir Abbas Nayyar's Short Stories: Narrative, Thought, and Thematic Dimensions

MUNIR ABBAS[1] AND DR. MUNAWAR AMIN[2]

[1] PhD Research Scholar, Department of Urdu, Minhaj University, Lahore, Pakistan.

[2] Assistant Professor, Department of Urdu, University of Southern Punjab, Multan, Pakistan.

Corresponding author: Munir Abbas (munirsipra9810@gmail.com)

ABSTRACT Dr. Nasir Abbas Nayyar is a distinguished Urdu fiction writer and critic whose stories delve into profound intellectual and theoretical discussions. His writings are not merely confined to storytelling but compel the reader to think critically. His literary mastery and Thought, Narrative and Thematic Dimensions are vividly reflected in all five books of his short story collections. His fiction encompasses diverse themes such as oppression, violence, politics, sociology, culture, colonialism, postcolonialism, existentialism, class division and psychological conflicts. He skillfully incorporates Punjab's folk wisdom, language, and expressions into his stories, creating a deep sense of familiarity and harmony for the reader. His writings highlight the significance of language and the power of narrative while establishing an intellectual resistance against authoritarian and colonial discourses. His fiction reflects social and cultural issues, addressing themes like identity crisis, loneliness, and emotional turmoil. His works employ intertextuality, symbolism, metaphors, and abstract language, offering a unique creative experience. His stories blend aesthetic beauty with intellectual depth, not only engaging the reader but also prompting reflection on life's complex questions. Thus, Nasir Abbas Nayyar's fiction stands as an exemplary fusion of intellectual stimulation and creative expression in Urdu literature.

Keywords Narrative, Thematic Dimensions, Colonialism, Postcolonialism, Culture.

ڈاکٹر ناصر عباس نیر اردو ادب کے ممتاز اور معتبر ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں بلکہ ادبی تھیوری کے عملی اور نظری مباحث میں بھی ایک مستند مقام رکھتے ہیں۔ وہ اردو میں مابعد نو آبادیاتی مطالعات کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ ان کی تنقیدی کتب میں "مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں"، "اردو ادب کی تشکیل جدید" (ایوارڈ یافتہ)، "ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری"، "جدید اور مابعد جدید تنقید"، "لسانیات اور تنقید"، "متن: سیاق اور تناظر"، "مجید امجد: حیات، شعریات اور جمالیات"، "اردو ادب کی تشکیل جدید، (دو مرتبہ ایوارڈ یافتہ)"، "اُس کو اک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں"، "نظم کیسے پڑھیں"، "جدیدیت اور نو آبادیات"، "اور نئے نقاد کے نام خطوط" اور دیگر شامل ہیں۔ ان کی تحریروں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ معنی کو محدود

***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

اور جامد تصور کرنے کے بجائے اسے وسعت اور تنوع کے ساتھ حقیقت سے قریب تر مانتے ہیں۔ روایتی آفاقیت اور مروجہ اصولوں کو چیلنج کرتے ہوئے، ان کے بیانیے مہابیانیوں کے سخت تصورات کے برخلاف نئی فکری راہیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی ادبی مہارت اور موضوعاتی و فکری گہرائی ان کے پانچوں افسانوں کے مجموعوں میں بخوبی جھلکتی ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ "خاک کی مہک" (۲۰۱۶ء) اپنی تازگی اور فکر انگیزی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں نمایاں ہوا۔ اس کے بعد دوسرا مجموعہ "فرشتہ نہیں آیا" (۲۰۱۷ء) ان کے فنی کمالات کا ایک اور اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ تیسرا مجموعہ "ایک زمانہ ختم ہوا ہے" (۲۰۲۰ء) ان کے تخلیقی سفر کی تسلسل کے ساتھ گواہی دیتا ہے، جبکہ "راکھ سے لکھی گئی کتاب" (۲۰۲۳ء) نے اردو افسانے کو ایک منفرد جہت عطا کی۔ ان کا پانچواں اور حالیہ مجموعہ "جب تک ہے زمین" (۲۰۲۵ء) ان کی فکری اور فنی معراج کا مظہر ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی یہ تخلیقات اردو ادب میں نہ صرف نئی راہیں متعارف کراتی ہیں بلکہ قارئین کو ایک وسیع اور گہری فکری کائنات میں لے جاتی ہیں۔ جہاں پرانی روایات کو نئے معانی میں ڈھال کر ایک جدید بیانیہ تشکیل دیا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے افسانے اپنی فکری گہرائی اور موضوعاتی وسعت کی وجہ سے اردو ادب میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خاص بات یہ ہے کہ وہ قاری کو محض کہانی سنانے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اسے غور و فکر کرنے پر اکساتے ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کا ایک ایسا تنوع موجود ہے جو انسانی زندگی کے کئی پہلوؤں کو محیط کرتا ہے۔ ان کے ایک ہی افسانے میں مختلف بیانیے، کئی موضوعات اور افکار پھوٹ رہے ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جبر، تشدد، ناانصافی، طاقت، منافقت، سیاست، ریاست، سماجیات، فطرت، ثقافت، مقامیت، عالمگیریت، وجودیت، نوآبادیات، مابعد نوآبادیات، مابعد جدیدیت، استعماریت، رد استعماریت، ناسٹلجیا، استحصالی ماحول، سرمایہ داری نظام، طبقاتی تقسیم، دیہاتی و شہری کلچر، اور نفسیاتی و جنسی الجھنوں جیسے موضوعات کو فکر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے افسانے محض ایک کہانی بیان کرنے کا عمل نہیں ہیں بلکہ یہ واہموں، خوابوں، لایعنیت، حکایتوں اور داستانوی طرزِ بیان کا امتزاج ہیں۔ ان کے افسانوی بیانیے کی ساخت میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بیان کنندہ کہانی بیان کرتے ہوئے کسی ضمنی خیال یا غیر متوقع موضوعات کی طرف مڑ جاتا ہے۔ کبھی وہ کسی خواب، کسی نئے خیال، نئی فکر، کسی قدیم روایت، کسی حکایت یا کسی اجنبی زمان و مکان کے قصے کا حوالہ دے کر کہانی کو ایک نئی سمت عطا کرتا ہے۔ یہ انداز قاری کو زمان و مکان کی محدودیت سے نکال کر معنویت کے ایک ایسے جہان میں لے جاتا ہے جہاں کہانی کا مقصد ایک جامد حقیقت کی وضاحت نہیں بلکہ متعدد امکانات کی کھوج بن جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک خاصہ یہ ہے کہ ان کے کئی جملے ایک مکمل مضمون کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ جملہ نہ صرف قاری کے سامنے ایک نئی فکر پیش کرتا ہے بلکہ اگلے جملے میں ایک اور منفرد زاویہ ابھرتا ہے، جو قاری کو مسلسل متوجہ رکھتا ہے۔ ان کے ایک افسانے میں کئی کئی بیانیے بھی ملتے ہیں۔ جو قاری کو فکری و نظری لحاظ سے سیراب کر رہے ہوتے ہیں۔

دراصل بیانیہ ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جس کے ذریعے کسی واقعے، تجربے یا خیال کو ترتیب، تسلسل اور راوی کے نقطۂ نظر سے اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قاری کے ذہن میں ایک مکمل اور معنی خیز تصور قائم کر دے۔ بیانیہ صرف کہانی سنانے کا عمل نہیں بلکہ اس میں واقعات کو اس طرح بُنا جاتا ہے کہ ان سے ایک خاص موقف یا خیال ابھرے۔ افسانے میں بیانیہ اس وقت مؤثر بنتا ہے

جب مصنف محض واقعات کی روداد بیان کرنے کے بجائے ان کے پیچھے چھپے ہوئے خیالات، جذبات، تضادات اور معاشرتی حوالوں کو اجاگر کرے، تاکہ قاری نہ صرف واقعات کو سمجھے بلکہ ان سے ایک خاص تاثر یا نظریہ اخذ کرے۔ مثلاً اگر ایک افسانہ طبقاتی ناانصافی پر مبنی ہے، تو واقعات، کرداروں کی زبان، اور راوی کا لہجہ سب مل کر ایسا بیانیہ قائم کرتے ہیں جو قاری کو ناانصافی کے خلاف سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یوں افسانہ محض تفریح نہیں رہتا بلکہ ایک فکری بیانیہ بن جاتا ہے جو قاری کی سوچ میں تبدیلی لا سکتا ہے۔

اسی طرح ناصر عباس نیر کے افسانے بھی محض کہانی سنانے کا عمل نہیں بلکہ فکری بیانیے کی تخلیق کا ذریعہ ہیں، جن کے ذریعے وہ معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی حقیقتوں کو نئے زاویے سے قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ انہوں نے بیانیہ کو صرف واقعات کی ترتیب کے طور پر نہیں، بلکہ ایک فکری موقف کے طور پر برتا ہے، جس میں نوآبادیاتی ذہنیت، ثقافتی الجھنیں، شناخت کا بحران، اور طاقت کے نظام جیسے موضوعات کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں راوی کا زاویۂ دید، علامتوں کا استعمال، اور زبان کا اسلوب، سب کچھ اس بات پر مرکوز ہوتا ہے کہ قاری محض کہانی نہ پڑھے بلکہ اس کے اندر چھپے فکری موقف اور تنقیدی نکتہ نظر کو محسوس کرے۔ یوں ناصر عباس نیر کے افسانے بیانیہ کو ایک فکری اور تنقیدی اظہار میں بدل دیتے ہیں، جو قاری کو سوچنے، سوال اٹھانے اور موجودہ نظام پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

ان کے افسانوی بیانیے میں انسانیت کی حمایت اور ظلم و استحصال کی مخالفت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔ ان کے افسانے انفرادی اور اجتماعی سطح پر طاقت کے ناجائز استعمال، ریاستی اداروں کے جبر اور سیاسی و سماجی ناانصافی کی کہانی سناتے ہیں، جو انسان کی آزادی اور وقار کو متاثر کرتے ہیں۔ ریاستی دہشت ان کے افسانوں میں ایک نمایاں عنصر کے طور پر موجود ہے۔ جہاں طاقتور ادارے عام افراد کی زندگیوں کو کنٹرول کرنے اور ان پر دباؤ ڈالنے کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کردار عموماً ایسے حالات میں دکھائی دیتے ہیں، جہاں ظلم اور ناانصافی ان کی شخصیت اور نفسیاتی حالت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ نوآبادیاتی اور نواستعماری قوتوں کے اثرات کو واضح کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے خلاف مزاحمت کا بیانیہ بھی تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے ہاں تاریخ اور عصری مسائل کی یہ آمیزش ان کے افسانوں کو نہ صرف فکری اعتبار سے بلند کرتی ہے بلکہ قاری کو موجودہ دور کے مسائل پر بھی غور کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسے ہی موضوع پر ان کا افسانہ ''پرانا اور نیا نظام انصاف'' ان کے چوتھے مجموعے میں موجود ہے۔ اس افسانے میں نہ صرف انصاف کے نظام کی غیر معقولیت اور طاقت کے بے جا استعمال پر تنقید کی گئی ہے بلکہ انسانی ذہن اور سماجی اصولوں کی تضاد زدہ فطرت کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے۔

افسانے کا بنیادی موضوع طاقت اور انصاف کے مابین تضاد ہے۔ افسانے کے کلیدی کردار بادشاہ اور اس کا مشیر اعلیٰ ہیں۔ انہی کے گرد ہی ساری کہانی بُنی گئی ہے۔ یہ دونوں کردار طاقت کی علامت کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔ ایک موقع پر بادشاہ کی اکتاہٹ اور مشیر اعلیٰ کی چالاکی یہ ظاہر کرتی ہے کہ کس طرح طاقتور لوگ اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے کے لیے قوانین اور انصاف کے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق بدل دیتے ہیں۔ بادشاہ کے فیصلے اور مشیر کی تجاویز انصاف کے نظام کی ناقص بنیادوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ جہاں قانون کو انسانیت کی بجائے طاقتور افراد کی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مصنف نے انصاف کے نظام میں

موجود ناانصافی اور بے جا تعصب کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ جرم کے بجائے نیت کو سزا دینے کا تصور انصاف کے نظام کی غیر حقیقی فطرت کو اجاگر کرتا ہے۔ قاضی اور مشیر کا رویہ یہ واضح کرتا ہے کہ انصاف کا معیار کس حد تک غیر معروضی اور ذاتی خواہشات کے تابع ہو سکتا ہے۔ یہ عدالتی نظام کی اس کمزوری کو عیاں کرتا ہے جو طاقتور افراد کے مفادات کے تابع ہو جاتی ہے۔ رعایا کے رویے میں تبدیلی، جہاں وہ جرم کے بجائے اپنی نیت کو درست ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ حکومت کی پالیسیوں کے انسانی ذہن پر اثرات کو نمایاں طور پر دکھایا گیا ہے۔

افسانے میں مصنف کا طنزیہ انداز اقتدار اور انصاف کے نظام پر تنقید کو مزید مؤثر بناتا ہے۔ بادشاہ کا اپنی اکتاہٹ کو ختم کرنے کے لیے انصاف کے نظام میں تبدیلی کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ طاقتور افراد اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے عوامی مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مشیر اعلیٰ کا نیا اصول کہ "ہر شخص جرم کی نیت رکھتا ہے" انسانی رویوں اور طاقت کے استعمال پر ایک گہری اور طنزیہ تنقید ہے۔ افسانے کا ایک اہم موضوع نیت اور خواہش کے درمیان فرق بھی ہے۔ مشیر کا اصول کہ "میری خواہش دوسرے کی نیت ہے" یہ ظاہر کرتا ہے کہ کس طرح طاقتور افراد اپنی خواہشات کو جواز بخشنے کے لیے دوسروں پر الزام لگاتے ہیں۔ عدالت میں عورت کے مقدمے کے دوران نیت اور خواہش کے فلسفے پر مباحثہ انسانی رویوں کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف نے بادشاہ کے مشیر کی اس بے تکی سوچ کو افسانے میں فلسفیانہ اور فکر انگیز انداز میں یوں پیش کیا ہے۔ مرقوم ہے:

> "مشیر نے پہلی مرتبہ سخت الجھن میں خود کو گھرا ہوا پایا۔ اب تک وہ جرم کی نیت اور خواہش کو ایک ہی چیز سمجھتا آیا تھا۔ اس نے ایک سادہ سا اصول بنایا تھا کہ 'میری خواہش ہی، دوسرے شخص کے یہاں جرم کی نیت ہے۔ چوں کہ میری خواہشیں لامحدود ہیں، اس لیے ہر شخص کے یہاں ہر طرح کے جرم کی نیت بھی موجود ہے۔' وہ خوش تھا کہ ایک سادہ سے اصول نے اسے دنیا بھر کے انسانوں کو سمجھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس سے اس کے دل میں یہ یقین بھی راسخ ہو گیا تھا کہ ہر شخص پیدائشی مجرم ہے۔"(۱)

افسانہ علامتی انداز میں لکھا گیا ہے، جہاں بادشاہ مطلق اقتدار کی علامت ہے، مشیر اعلیٰ چالاکی اور سیاسی مہارت کی نمائندگی کرتا ہے، اور چرواہا عوام کی معصومیت کی عکاسی کرتا ہے۔ عورت کا کردار ایک آزاد اور بے خوف انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو معاشرتی اصولوں کے خلاف سوال اٹھانے کی ہمت رکھتی ہے۔ قاضی انصاف کے نظام کی نمائندگی کرتا ہے، جو طاقتور افراد کی مرضی کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "لکھنا بھی سزا ہے پر آدمی ہونا بڑی سزا ہے" میں ایک ایسے جابرانہ معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے جہاں ریاست انسان کی آزادی، شعور اور تخلیقی اظہار پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ شہر میں سپاہی جاسوس بن کر ہر فرد کی نگرانی کرتے ہیں، جس سے خوف اور اجنبیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک مسافر جب اس شہر میں رہائش کی اجازت حاصل کرتا ہے، تو اس پر بھی وہی سخت شرائط لاگو کی جاتی ہیں۔ افسانے میں علامتوں کا موثر استعمال کیا گیا ہے۔ بدن کی بو فرد کی شناخت کی علامت ہے جو جبر کے باوجود چھپائی نہیں جا

سکتی۔ دیوار سب سے اہم علامت ہے، جس پر روز کچھ لکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے، لیکن یہاں لکھنا آزادی نہیں بلکہ سزا ہے۔ ہر لفظ ریاست کے کنٹرول میں ہے اور تخلیق خوف میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے معاشرے کا استعارہ ہے جو ظلم، خوف اور ریاستی جبر کی بنیاد پر فرد کی آزادی سلب کرتا ہے۔

افسانے میں جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جو جبر کے زیر اثر انسانی حالت کی بگاڑ کو ظاہر کرتا ہے۔ جن میں ان کے دانتوں کا بڑھ جانا، عجیب الخلقت اور جانوروں کی طرح شکل ہو جانا شامل ہے۔ یہ سب سماجی اور ذہنی انحطاط کا استعارہ ہے جو جبر اور خوف کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ بادشاہ کی طرف سے قتل کی ممانعت اور اس کے نتیجے میں خودکشیوں کا بڑھ جانا، انسانی جذبات کو دبانے کی کوششوں کے منفی اثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جو ایک مسافر ہے اس کے ذریعے فرد کی انفرادی شناخت اور آزادی کے حق کو نمایاں کیا گیا ہے۔ افسانے کے آخر میں اسی مسافر کا اظہار مصنف نے بہت ہی معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے:

> "اسے شہر میں قیام کی اجازت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ اس دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ اس نے پہلے سوچا کہ وہ اندھوں اور گونگوں کے شہروں کا مختصر احوال لکھے گا۔ پھر کچھ سوچ کر اتنا لکھا: لکھنا بھی سزا ہے، پر کسی بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے۔"(۲)

مسافر کا یہ کہنا کہ 'لکھنا بھی سزا ہے، پر کسی بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے،' انسانی آزادی کی قدر اور ریاستی جبر کے خلاف احتجاج کی ایک علامتی صدا ہے۔ یہ جملہ انسانی شعور، آزادی اور وجود کے بنیادی سوالات کو اجاگر کرتا ہے۔ مجموعی بات کی جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ناصر عباس نیر کے اس افسانہ میں ریاستی جبر، سماجی، سیاسی، انصاف اور نفسیاتی مسائل جیسے موضوعات ہیں۔ طاقت کے ذریعے جبر، آزادی کی اہمیت اور فرد کی تخلیقی صلاحیتوں پر پابندی کے اثرات کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جو قاری کو سوچنے اور سماج کے رویوں پر سوال اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "پروشاسی، کروفر، فروشاسی" میں انسانی شعور، تخلیقی آزادی اور جبر کے باہمی تعلق کو علامتی اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کے کردار پروشاسی، کروفر اور فروشاسی انسان کے اندرونی تخلیقی عناصر اور بیرونی جابرانہ قوتوں کے درمیان جدوجہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افسانے میں بادشاہ کا کردار اقتدار اور جبر کی علامت ہے، جو ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق قابو میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس کا خوف اقتدار کے نفسیاتی پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ جسارت علی خاں تخلیقی آزادی اور ماضی سے وابستگی کا استعارہ ہے، جو جبر کے خلاف تخلیقی احتجاج کی علامت ہے۔ افسانہ دراصل اس بات کی گہرائی سے وضاحت کرتا ہے کہ تخلیق اور آزادی ہمیشہ طاقتور قوتوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف رہتی ہیں۔ اسی بنیادی فکر کو مصنف نے ایک جملے میں پیش کر دیا ہے:

> "جسارت علی خان نے شفاعت اللہ سے کہا کہ ناانصافی، پرانی ہو کر بھی ناانصافی رہتی ہے اور تاریخ کے سینے پر بوجھ کی مانند ہوتی ہے۔"(۳)

ناصر عباس نیر کے افسانوں میں بین المتونیت کا عنصر بہت نمایاں ہے، جو ان کے بیانیے کو مزید معنی خیز اور متنوع بناتا ہے۔ بین المتونیت کے ذریعے وہ مختلف متون، خیالات اور حوالہ جات کو اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں اور انہیں ایک نئی معنویت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

بین المتونیت ایک ادبی اصطلاح ہے جو مغرب سے روشناس ہوئی۔ جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ:

"بین المتونیت کی اصطلاح فرانسیسی نظریہ ساز ژولیا کرستیوا نے وضع کی ہے۔ مراد یہ ہے کہ کوئی بھی متن ایسا نہیں (خواہ وہ ناول ہو یا نظم یا تاریخی دستاویز) جسے اپنے آپ میں مکمل اور خود مختار سمجھا جائے۔ ہر متن دوسرے معنوں کے توسط سے وجود میں آتا ہے۔ پڑھنے والا کسی متن کے معنی تک اسی صورت میں پہنچے گا جب وہ پہچان لے کہ زیر نظر متن کا دوسرے متنوں سے کیا تعلق ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر متن دوسرے متون (یا اظہار کی طرزوں) کو اپنے میں جذب اور منقلب کرتا رہتا ہے۔ گویا بین المتونیت کا نظریہ یہ دعویٰ رکھتا ہے۔ کسی متن کا از خود وجود نہیں۔ صرف مسلسل تعبیرات اور بعض تعبیرات کا عمل اس کے وجود کا ضامن ہے۔ اس طرح متن کی کسی خواندگی کو قطعیت کا حامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہر خواندگی ایک نئے متن کو سامنے لائے گی اور یہ متن فوراً ہی اس سلسلے کا حصہ بن جائے گا جس کی حدود میں رہ کر متن کی کوئی تشریح ممکن ہے۔"(۴)

بین المتونیت کا یہ تصور ادب، ثقافت، تاریخ، اور زبان کے مختلف پہلوؤں کے ذریعے متون کے درمیان روابط کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ایک متن کسی دوسرے متن سے متاثر ہو سکتا ہے یا اس میں کسی دوسرے متن کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ متون کے درمیان یہ تعلق اکثر ادبی گفت وشنید یا مکالمہ کی صورت میں سامنے آتا ہے، جہاں ایک متن دوسرے متن کے خیالات، موضوعات یا طرز کو چیلنج یا جاری رکھتا ہے۔ ایک متن کے معنی سمجھنے کے لیے اس کے دیگر متون کے ساتھ تعلق کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ بین المتونیت میں کسی متن کا اقتباس یا تقلید شامل ہو سکتی ہے۔ یہی صورت حال ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے اس افسانے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ افسانہ ظاہر کرتا ہے کہ تخلیقی عمل ایک مسلسل عمل ہے، جو ماضی، حال، اور مستقبل کو جوڑتا ہے۔ یہ عمل ایک تخلیق کار کی بنیادی ذمہ داری ہے، جو نہ صرف اسے اپنے شعور کا اظہار کرنے کی اجازت دیتی ہے بلکہ اس کی تحریر کو ایک تاریخی استعارہ بھی بنا دیتی ہے۔ افسانے میں پیش کیے گئے فلسفیانہ مباحث، جیسے کہ خیالات کی حفاظت، جبر کے خلاف آزادی کی جدوجہد، اور انسانی شعور کی گہرائی، قاری کو متن کے ساتھ ایک گہری ذہنی وابستگی قائم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہانی نہ صرف ایک تخلیقی احتجاج ہے بلکہ ایک فکری دعوت بھی ہے، جو قاری کو اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں متن کو سمجھنے اور اس کی تشریح کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔

یہ افسانہ انسانی آزادی، تخلیقی فکر، اور اقتدار کے جبر کے درمیان تعلق پر ایک گہری روشنی ڈالتا ہے۔ ناصر عباس نیر نے اس کہانی کے ذریعے ایک ایسا تخلیقی تجربہ پیش کیا ہے، جو نہ صرف قاری کو محظوظ کرتا ہے بلکہ اسے انسانیت، آزادی، اور تخلیق کے فلسفے پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مصنف نے سیاست اور ریاست کے مکروہ چہرے مختلف انداز میں دکھائے ہیں۔ مصنف نے اپنے افسانے ''تمہارا قانون'' میں بھی ایسی ہی صورت حال کو دکھایا ہے۔ اس افسانے میں ایک سیاسی قیدی کی جدوجہد، مزاحمت اور جبر کے

سامنے انفرادی واجتماعی انسانی وقار کی جنگ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہانی ریاستی ناانصافی، اقتدار کی زیادتی اور انسان کے اندرونی تضادات کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک سیاسی قیدی ہے۔ جسے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی اذیتوں کا سامنا ہے۔ اس کے وجود میں جاری کشمکش انسان کی آزادی، وقار اور ظلم کے خلاف مزاحمت کی علامت ہے۔ وہ ایک طرف بھوک، بیماری اور اذیت برداشت کرتا ہے، اور دوسری طرف اپنی روح کی طاقت اور اپنے اصولوں پر ڈٹا رہتا ہے۔ وہ ریاستی و حکومتی مشینری کے سامنے ڈٹ کے کھڑا ہوتا ہے۔ ایک بار جیل کے اندر ہی کوئی اعلیٰ افسران کو ملنے آتا ہے بلکہ اسے ڈرانے دھمکانے آتا ہے۔ وہ افسر بہت ڈرانے کی باتیں کرتا لیکن وہ نڈر قیدی اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور خاموشی سے صرف سنتا رہتا ہے۔ جب سرکاری افسر نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی تو تب اس نے اپنی خاموشی توڑی اور اس کو مخاطب ہوا:

> "مصیبت خواہ کتنی بڑی ہو، آدمی سے اس شعور کو چھین نہیں سکتی، ہو سکتا ہے کچھ دیر کے لیے معطل کر دے۔ جو اسے بتاتا ہے کہ مصیبت آئی کہاں سے؟ یہ وہ سچ ہے جس سے تم ڈرتے ہو۔۔۔ اس کی آواز کچھ لمحوں کے لیے لرزی، پھر وہ اعتماد سے بولنے لگا۔ اگر تم میری موت کا فیصلہ کر کے آئے ہو تو پھر اس صورت حال سے، جس میں تمھارے بڑوں نے مجھے اور تمھیں مبتلا کیا ہے۔ نکل کر پل بھر کے لیے سوچو کہ کیا موت کے کنارے پر کھڑے شخص سے بات کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے؟ اگر تم واقعی موت جیسی چیز سے آزاد ہوتے تو پھر تم مجھ سے ہر بات کہنے کا اختیار رکھتے۔"(۵)

ناصر عباس نیر کے اس افسانے میں ایک سیاسی قیدی کی مزاحمت کے ذریعے ظلم، جبر، اور طاقت کے نظام پر گہری تنقید کی گئی ہے۔ قیدی کو توڑنے کے لیے جیل کا ہر اہلکار 'سنتری سے اعلیٰ افسر تک' طاقت کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتے ہیں، مگر قیدی اپنے اصولوں پر ثابت قدم رہتا ہے۔

جیل کی کوٹھڑی اور افسر کا دفتر طاقت اور عوام کے درمیان تفاوت کو ظاہر کرتے ہیں، جبکہ قیدی کا کہنا "دیس کے سب بچے ہمارے ہیں" اس کے اجتماعی شعور اور انسانیت سے وابستگی کی علامت ہے۔ قیدی کی مزاحمت انفرادی عزم سے بڑھ کر اجتماعی جدوجہد کی علامت بن جاتی ہے۔ اگرچہ ریاست اسے قتل کر دیتی ہے، لیکن اس کی قربانی ایک یادگار کے ذریعے زندہ رکھی جاتی ہے، جو خود ریاستی منافقت کا استعارہ بن جاتی ہے۔ افسانہ آزادی، انسانی وقار، مزاحمت اور اصولوں پر قربانی جیسے اہم موضوعات کا احاطہ کرتا ہے، اور یہ پیغام دیتا ہے کہ ظلم کے خلاف ڈٹے رہنا ہی اصل آزادی کی راہ ہے۔

ناصر عباس نیر کا افسانہ "غارت گر" ظلم، جبر اور وقت کی بے رحمی کے خلاف فن کی مزاحمت کا استعارہ ہے۔ افسانے میں انسان کی خواہشات، خواب اور احساسات کو وقت کے جبر کے حوالے کیا گیا ہے، تاہم فن کو ایسی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو ان تباہ کن قوتوں سے ماورا ہے۔ مصنف ثابت کرتے ہیں کہ تخلیقی فن تخلیق کار کی ذات کی گہرائیوں سے جنم لیتا ہے، جہاں وقت یا جبر کی رسائی ممکن نہیں۔ یہی فن استعماری اور استبدادی قوتوں کے خلاف ایک فکری مزاحمت بن جاتا ہے، ذہن کو آزاد کرتا ہے اور نئی فکری راہیں

کھولتا ہے۔ یہ افسانہ ان طاقتور طبقات کی نفسیات کو بھی بے نقاب کرتا ہے جو اختیار کھونے کے خوف میں انسانی خیالات تک کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طاقتیں تعلیم اور ثقافت جیسے نظاموں کو استعمال کر کے جبر کو دوام بخشتی ہیں۔ افسانہ ''غارت گر'' میں ناصر عباس نیر فن کی قوت کو ظلم کے خلاف ایک مستقل مزاحمت کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو ان کے بیانیے کو فکری گہرائی، معنویت اور انفرادیت عطا کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "شر پسند" میں معاشرتی جمود، ذہنی غلامی اور جبر پر گہری تنقید کی گئی ہے۔ افسانہ عوام کی اندھی تقلید اور حکمران طبقے کے ظلم کو بے نقاب کرتا ہے، جہاں طاقتور طبقہ خوف کے ذریعے عوام کو قابو میں رکھتا ہے، اور عوام اپنی غلامی کو قبول کر کے اس کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ، ظلم کا نمائندہ ہے اور اس کے مشیر خوف پھیلانے کے ماہر۔ کہانی میں مزاحمت کرنے والوں کو دبا دیا جاتا ہے اور جھوٹے بیانیے عوام کو حقیقت سے دور رکھتے ہیں۔ "شر پسند" معاشرتی شعور بیدار کرنے والا افسانہ ہے جو ظلم کے خلاف مزاحمت کی ضرورت پر زور دیتا ہے۔ اسی فکر کا تسلسل افسانہ "گڑ اور گولیاں" ہے، جو جدید ریاستی و سماجی جبر کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ افسانہ گڑ خریدنے کے ایک سادہ واقعے سے شروع ہو کر گہرے سیاسی اور اخلاقی سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ افسانہ دکھاتا ہے کہ جدید معاشرہ صرف اشیا نہیں، بلکہ اقدار کو بھی مارکیٹ میں تولتا ہے، اور انسان کی آزادی بتدریج محدود ہوتی جا رہی ہے۔

افسانے کا دوسرا حصہ ایک نئے زاویے کو جنم دیتا ہے۔ ایک پر سکون منظر اچانک تشدد اور جبر کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ راوی کے سامنے والی بال کھیلنے والے نوجوانوں پر فوجیوں کی فائرنگ کا واقعہ، ایک جابرانہ ریاستی نظام کی علامت بن جاتا ہے۔ یہاں، والی بال کھیلتا نوجوانوں کی معصومیت اور زندگی کے آزادانہ پہلو کو ظاہر کرتا ہے، جبکہ ان پر چلائی گئی گولی جدید ریاستی نظام کے جبر اور انسانی آزادی کو دبانے کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس صورت حال کی راوی (متکلم) کی زبانی ناصر عباس نے یوں منظر کشی کی ہے:

> "بس ایک لمحے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے پار، ایک میدان میں کچھ نوجوان والی بال کھیل رہے ہیں۔ اس سڑک سے ایک فوجی ان پر سیدھی گولی چلاتا ہے، والی بال کھیلنے والا ایک نوجوان تڑپ کر گرتا ہے۔ کچھ نوجوان بھاگ جاتے ہیں اور کچھ اس نوجوان کو سنبھالنے لگتے ہیں۔ گولی چلانے والا فوجی اس طرح سڑک پر تیز چل رہا ہے، جیسے بچے اور نوجوان پہیوں والے جوتوں (سکیٹنگ شوز) پر چلتے ہیں۔ اس نے اسی طرح بھاگتے ہوئے گولی چلائی تھی مگر اس کا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔۔۔ میں اب گاڑی کو بھول چکا ہوں اور اپنے بچاؤ کے لیے فکر مند سڑک کی الٹی طرف بھاگ رہا ہوں۔"(۶)

افسانے کا یہ حصہ قارئین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، جہاں معمولی واقعات میں چھپا ہوا تشدد اور ظلم سامنے آتا ہے۔ فوجی جوانوں کا بھاگتے ہوئے نوجوانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا ایک ایسی ریاستی مشینری کی نمائندگی کرتا ہے جو طاقت کی وجہ سے غیر انسانی اور بے حس ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ، فوجی وردیوں کا ذکر اور ان کے غائب ہونے کا منظر، ریاستی جبر کی غیر مرئی طاقت کو ظاہر کرتا ہے جو کہانی کے عمومی تناظر کو ایک گہرے سیاسی اور اخلاقی سوال میں تبدیل کرتا ہے۔

مجموعی بات کی جائے تو افسانہ ''گڑ اور گولیاں''میں ناصر عباس نیر نے ایک منفرد انداز میں جدید سماج کے جبر، ظلم اور بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ میں نہ صرف ریاستی تشدد اور جبر پر تنقید کی گئی ہے بلکہ قارئین کو اس نظام پر جو معصوم انسانی زندگیاں تباہ کر رہا ہے، اس پر سوال اٹھانے کی ترغیب بھی ملتی ہے۔ ناصر عباس نیر کے افسانہ ''ستر سال اور غار''میں سیاسی و ریاستی ظلم و جبر کو ایک گاؤں کی علامت کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں گاؤں میں قتل و غارت کے واقعات اور ان کے پیچھے چھپی طاقتوں کا راز کھولا گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ خوفزدہ اور بے یقینی میں مبتلا ہیں، اور ظاہری زندگی گزار رہے ہیں، جبکہ اصل مسئلے سے لاعلم ہیں۔ ایک متقی شخص اسحاق کو حل کے لیے بلایا جاتا ہے، جو غار میں ستر سال مقیم ایک رازدار شخصیت کی موجودگی کا انکشاف کرتا ہے۔ تاہم، جب گاؤں والے غار جاتے ہیں تو اسحاق خود قتل ہو چکا ہوتا ہے، جس کے بعد گاؤں میں امن قائم ہو جاتا ہے۔ کہانی اس بات پر سوال اٹھاتی ہے کہ آیا اسحاق قاتل تھا یا نظام کا آلہ کار؟ یہ افسانہ ظلم، منافقت، اور خوف کے نظام کی علامت ہے، جہاں اسحاق ظاہری نیکی کے پردے میں سماجی بدامنی کا باعث بنتا ہے۔ اسحاق کی موت کے بعد امن بھی ممکنہ طور پر دھوکہ ہے، کیونکہ نظام کے جڑیں باقی رہتی ہیں۔ مصنف نے قاری کو فکر کرنے پر مجبور کیا ہے کہ آیا اسحاق خود قاتل تھا یا نظام کا شکار، اور یہ کہانی سماجی و سیاسی نظام کی پیچیدگیوں کا آئینہ ہے۔

ناصر عباس نیر کے اس افسانے میں دیہی رنگ اور مقامی و ثقافتی عناصر بھی پائے جاتے ہیں کیونکہ اس کہانی کو گاؤں کے پس منظر کے لحاظ سے بُنا گیا ہے۔ مصنف کا ایسا ہی ایک اور افسانہ ''عورت کو زیادہ محبت کس سے ہے؟'' ہے۔ اس افسانے میں دیہی کلچر کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات، سماجی رویوں اور انصاف کے پیچیدہ تصورات کو نہایت گہرائی اور فنکاری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں دیہاتی زندگی، قدیمی روایات، انسانی جذبات، عورت کے مقام، سماجی عدل اور جدیدیت کے درمیان تصادم کو اجاگر کیا گیا ہے۔ افسانے میں دو کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی کہانی ایک ایسے سانحے کے گرد گھومتی ہے جہاں ایک بیٹا اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ معاملہ گاؤں کے روایتی عدالتی نظام (پریہنہ) کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ مقدمے میں باپ مقتول، بیٹا قاتل اور ماں مدعی ہوتی ہے۔ پریہنہ کے بزرگ اس مقدمے میں متفقہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور ماں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو معاف کر دے، لیکن ماں اپنے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور انصاف کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھتی ہے۔ اس کی آخری سانس تک یہ ضد قائم رہتی ہے کہ بیٹے کو سزا ملنی چاہیے۔ آخر کار ماں کی وفات کے بعد عدالت بیٹے کو رہا کر دیتی ہے۔ یہ کہانی قارئین کے لیے ایک گہرا سوال چھوڑ جاتی ہے کہ محبت اور انصاف کے درمیان کیا انتخاب کیا جائے۔ دوسری کہانی کنیز نامی عورت اور اس کی پانچ سالہ بیٹی کے گرد گھومتی ہے۔ اس بچی کا مقدمہ بھی گاؤں کی پریہنہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں سماجی ناانصافی اور عورت کے وجود پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس پریہنہ کا نقشہ مصنف نے اس طرح پیش کیا:

> "سہ پہر کا وقت، گرمیوں کا موسم، گاؤں کے درمیان درختوں کے ایک مختصر جھنڈ کے سائے میں، چارپائیوں پر دس رکنی پریہنہ بیٹھی ہے۔ سامنے چارپائی پر کنیز اکیلی بیٹھی ہے۔ آس پاس نیم دائرے کی شکل میں بچھی چارپائیوں پر درجنوں جوان اور بزرگ موجود ہیں، جن کو مجلس کی کارروائی صرف سننے کی اجازت ہے۔۔۔ چند دن پہلے ایک چار سالہ بچی کے قتل کا مقدمہ زیر بحث

ہے۔ سب لوگ واقعہ سن چکے ہیں۔"(۷)

افسانے میں کنیز کی پیچیدہ زندگی اور اس کی بیٹی کے قتل کے راز کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کنیز نے چار شادیاں کیں اور اپنی بیٹی کے قاتل کی تلاش میں گاؤں کی روایتی عدالت "پریہنہ" کا سہارا لیا، جہاں سماجی تعصبات نے اسے ہی مجرم ٹھہرانے کی کوشش کی۔ افسانہ عورت کی محبت، سماجی ناانصافی اور انصاف کی جستجو کے اہم موضوعات پر گہرے فکری سوالات اٹھاتا ہے۔ کنیز کی جدوجہد، اس کی بے بسی اور معاشرتی دباؤ کو ماہرانہ بیانیہ کے ذریعے اجاگر کیا گیا ہے، جبکہ قاتل کی اصل شناخت کہانی کے اختتام تک مبہم رکھی گئی ہے۔ یہ کہانی عورت کی محبت کے پیچیدہ اور متنوع پہلوؤں پر قاری کو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے کچھ دیگر افسانوں میں، خاص طور پر "درخت باتیں ہی نہیں کرتے۔۔۔"، "خاک کی مہک"، "جھوٹ کا فیسٹیول"، "مرنے کے بعد مسلمان ہوا جا سکتا ہے؟"، "فرشتہ نہیں آیا"، "کفارہ"، "کہانی کا کوہ ندا" وغیرہ میں مقامیت، دیہی ثقافت کی عکاسی نمایاں، منفرد اور گہرے انداز میں کی گئی ہے۔ ان افسانوں میں پنجاب کی دیہی معاشرت، اس کی سماجی معاملات، بود و باش، رہن سہن اور دیہی زندگی کے مسائل کو نہایت باریکی سے پیش کیا گیا ہے۔ ان افسانوں میں دیہات کی زندگی صرف ایک پس منظر کے طور پر نہیں، بلکہ ایک زندہ کردار کے طور پر ظاہر ہوتی ہے، جس میں انسانوں کے ساتھ ساتھ مٹی، زمین، اور اس کے مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ناصر عباس نیر دیہات کے طبقاتی نظام اور اس سے جنم لینے والے مسائل کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جاگیر دارانہ نظام کے اثرات، محنت کش طبقے کی مشکلات، اور سماجی تعصبات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں دیہی کردار اپنی تہذیب اور رواجوں کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ان کے ساتھ سماجی ناانصافیوں اور استحصالی رویوں کا سامنا بھی کرتے ہیں۔ غیرت کے نام پر قتل، تشدد اور اخلاقیات جیسے موضوعات ان کے افسانوں کا حصہ ہیں۔ یہ موضوعات دیہی معاشرت کی حقیقی عکاسی کرتے ہیں، جہاں ان مسائل کو اکثر روایتی اقدار کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر ان رویوں پر تنقید کرتے ہیں اور ان کے نفسیاتی و سماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ کچھ افسانوں میں دیہی زندگی کے ساتھ گہرے روحانی سوالات کو بھی اٹھایا گیا ہے، جیسے زندگی اور موت کے مفہوم، مذہب کا کردار، اور انسان کے روحانی تجربات وغیرہ۔ مثال کے طور پر، "کہانی کا کوہ ندا" میں کہانی اور حقیقت کے تعلق پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں، مصنف اپنی فنکاری سے دیہی زندگی کی عام سی کہانیوں کو ایک فلسفیانہ گہرائی دیتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کے افسانوں میں دیہی زندگی کی جزئیات، مثلاً زمین کا ذکر، مٹی کی مہک، کسانوں کی زندگی، گاؤں میں فطرت کے مناظر اور دیہاتی طرزِ زندگی کی روزمرہ کی جدوجہد کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت نگاری دیہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرتی ہے، جن میں محنت، محرومی اور امید کے عناصر شامل ہیں۔ مصنف دیہی زندگی کو صرف ایک سادہ ماحول کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اسے وجودی سوالات اور فلسفیانہ مباحث کے لیے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے افسانے قارئین کو یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ دیہی زندگی میں چھپی کہانیاں کیا صرف حقیقت کی نمائندگی کرتی ہیں یا ان میں کوئی دوسرا امکان بھی موجود ہے؟ ناصر عباس نیر کے یہ افسانے فطرت، دیہی ثقافت اور مقامیت کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو نہ صرف حقیقت پسندانہ ہے بلکہ گہرے معنوی پہلو بھی رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس کے کچھ افسانے دیہی زندگی کے مسائل اور اس کی روحانی و فلسفیانہ جہات کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ قاری صرف کہانی نہیں پڑھتا بلکہ دیہاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو محسوس بھی کرتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے افسانے "ولدیت کا خانہ" میں بھی ایسے ہی عناصر موجود ہیں۔ یہ افسانہ ماسٹر اسمعیل کے کردار کے گرد گھومتا ہے۔ جس کی ذاتی کشمکش اور فکری سفر دیہات کی سادہ مگر گہری زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔ افسانے میں بوہڑ کے درخت کے حوالے سے منظر نگاری کی گئی ہے۔ جو کہ دیہاتی زندگی میں ایک اہم علامت کے طور پر سمجھا جاتا ہے ہے۔ مرقوم ہے:

"بستی کے عین بیچ بوہڑ کا درخت۔۔۔سائیں کی داڑھی کی طرح زمین کی طرف لٹکی شاخیں۔"(۸)

یہ درخت دیہات میں نہ صرف سایہ اور سکون کا ذریعہ ہوتا ہے بلکہ روحانیت اور فطرت سے جڑت کی علامت بھی ہوتا ہے۔ ماسٹر اسمعیل کا درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنی ذات اور کائنات پر غور و فکر کرنا دیہات کے لوگوں کے قدرت سے گہرے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے۔ درخت کے ذریعے انسان اور مٹی کے تعلق کو اجاگر کرنا دیہاتی ثقافت کی عکاسی ہے۔ دیہات کی ثقافت میں روحانی رہنماؤں کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس افسانے میں سائیں اور شاہ صاحب کے کردار اسی روایت کی عکاسی کرتے ہیں۔ سائیں کی ادھوری باتیں اور شاہ صاحب کے ذریعے ان کی وضاحت دیہاتی زندگی کی پر اسراریت اور لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کی روایت کو بیان کرتی ہیں۔ یہ کردار نہ صرف مذہبی بلکہ فکری رہنمائی کے لیے دیہاتی لوگوں کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔ مصنف نے فطرت اور مٹی کو اہمیت دی ہے۔ مٹی کو عورت کے بطن سے تشبیہ دینا، اور درختوں کی مثال کے ذریعے انسان اور فطرت کے گہرے رشتے کو بیان کرنا دیہاتی ماحول کا ایک اہم پہلو ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دیہات میں قدرتی عناصر کو انسانی زندگی سے کیسے جوڑا جاتا ہے۔ ماسٹر اسمعیل کی تنہائی اور خود کلامی دیہاتی زندگی کے اس پہلو کو اجاگر کرتی ہے، جہاں لوگ اکثر اپنے اندرونی سوالات کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔

مجموعی طور دیکھا جائے تو افسانہ "ولدیت کا خانہ" میں دیہاتی زندگی کی سادگی، فطرت سے جڑت اور سماجی پیچیدگیوں کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ بوہڑ کے درخت کی علامت، سائیں اور شاہ صاحب کے کردار، مٹی اور عورت کا رشتہ اور ماسٹر اسمعیل کی فکری کشمکش دیہاتی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے دیہاتی زندگی کی فلسفیانہ گہرائی اور انسانی نفسیات کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جو قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ناصر عباس نیر کے چوتھے افسانوی مجموعے کے پہلے افسانے "درخت باتیں ہی نہیں کرتے۔۔۔" میں دیہی زندگی اور فطرت کے گہرے تعلق کو حساس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار دادا کے ذریعے درختوں اور پرندوں سے محبت اور ان کی حفاظت کا شعور واضح کیا گیا ہے۔ افسانہ فطرت کو صرف مادی وسائل کے طور پر نہیں بلکہ زندہ اور معنویت سے بھرپور حصہ سمجھتا ہے، جہاں درختوں کی کٹائی کو بیٹے کی بیج کی طرح دکھایا گیا ہے۔ دادا کی ماحولیاتی فکر اور دیہی زندگی سے گہری وابستگی اس کہانی کا محور ہے، جو محبت، سادگی اور ماحول کی حفاظت کا درس دیتی ہے۔ مصنف دادا کے درختوں اور پرندوں کے ساتھ لگاؤ کو بہت عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"گھر آتے تو ہر درخت کے نیچے باری باری بیٹھا کرتے تھے۔ گھر میں چار درخت تھے۔ ٹاہلی،

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

> شرینہ، کیکر اور شہتوت۔ شہتوت سے کبھی کبھی الرجی بھی انھیں ہو جایا کرتی تھی، مگر وہ اس کے نیچے چارپائی ڈلوا کر بیٹھا کرتے۔ ابا سے، اماں سے، دادی سے، چچا سے باتیں کرتے۔ ان کی باتوں میں دنیا جہان کی باتیں ہوتیں؛ رشتہ داروں کی، آس پاس کے زمین داروں کی زمینوں کی فصلوں کی کبھی کبھی مذہب اور سیاست پر بھی بات کر لیتے۔ ہر بار ان میں پرندوں اور درختوں کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے دنیا جہان میں کتنا کچھ شامل تھا! وہ بتاتے کہ کب درختوں کے پتے گرتے ہیں، کب کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس وقت ان کو کتنا پانی دینا چاہیے۔ کب درختوں کو چھانگنا چاہیے اور کون سی شاخیں چھانگنی چاہیں۔ کسی درخت پر کون سا پرندہ گھونسلا بناتا ہے اور کس پر محض وقت گزاری کے لیے اور شاید ہماری اور دوسرے پرندوں کی باتیں سننے، سنانے آتا ہے۔ کون سا پرندہ کب انڈے دیتا اور سیتا۔"(۹)

افسانے میں فطرت کو انسانی جذبات کے آئینے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پرندوں کی بے چینی کو ہندوؤں اور سکھوں کی نقل مکانی سے جوڑنا فطرت اور انسانی المیے کے درمیان تعلق کو واضح کرتا ہے۔ دادا کا کبوتروں کی جوڑی سے وابستگی ان کے اندرونی دکھ اور خلا کی عکاسی کرتا ہے، جو ایک گمشدہ شے کی تلاش میں ہمیشہ مضطرب رہتا ہے۔ ناصر عباس نے افسانہ میں فطرت، ماحول اور دیہی زندگی کے درمیان گہرے تعلق کو ایک ادبی اور علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ کہانی نہ صرف ماحولیات کے بارے میں شعور پیدا کرتی ہے بلکہ انسانی زندگی میں فطرت کی اہمیت اور جذباتی اثرات کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ دادا کا کردار دیہی زندگی کی علامت ہے، جو جدید دور کی تیز رفتار زندگی میں کھو جانے والے سکون اور فطرت سے جڑے جذبات کی یاد دلاتا ہے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو منفرد انداز میں پیش کرتے ہیں، جہاں کرداروں کی داخلی کشمکش، جذباتی تضادات اور شعور و لاشعور کے تصادم کو باریکی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی کہانیوں میں جنسی نفسیات، محبت اور خواہشات کی پیچیدگیاں اہم موضوعات ہیں جو کرداروں کی شخصیت سازی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ افسانہ "فرشتہ نہیں آیا" میں ایک معصوم بچی کی تکلیف دہ جدوجہد دکھائی گئی ہے، جو غیر منصفانہ حالات میں اپنی ہمت اور حوصلے سے زندگی کا مقابلہ کرتی ہے، جبکہ اس کی مدد کے لیے کوئی فرشتہ نہیں آتا۔ ناصر عباس نیر کے کردار مشکلات کے باوجود ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ نئی راہیں تلاش کرتے ہیں، جو ان کی زندگی سے جدوجہد اور امید کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس کہانی میں جنسیت اور طاقت کے مظاہر کو انسانی جدوجہد اور معصومیت کے تناظر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک معصوم بچی کی زندگی میں پیش آنے والے دردناک واقعات کو علامتی اور فکری انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہانی میں مرد کا کردار "جنسی عفریت" کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو جنسیت کو طاقت اور غلبے کے آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ انسانی حیوانیت بعض اوقات جنسیت کے ذریعے اپنے غالب اثرات چھوڑتی ہے۔ بچی کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ جنسیت کی اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ یہ ہمیشہ رضامندی اور محبت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ اکثر اوقات جبر اور استحصال کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

کہانی میں "فرشتے" امید کی علامت ہیں جو کمزور افراد رکھتے ہیں، لیکن کہانی یہ پیغام دیتی ہے کہ مدد خود اپنی جدوجہد سے حاصل کرنی ہوتی ہے۔ جنسی استحصال کا شکار افراد اکثر تنہا ہوتے ہیں کیونکہ سماج یا کوئی ماورائی طاقت ان کی مدد نہیں کرتا۔ بچی کی مضبوطی اس بات کی نشانی ہے کہ مظلوم کو اپنی طاقت سے حالات کا سامنا کرنا چاہیے، نہ کہ ماورائی مدد کا انتظار۔ مصنف نے جنسیت کو حیوانیت سے جوڑ کر دکھایا ہے کہ جنسی جذبات انسانیت اور اخلاقیات کی حدیں توڑ دیتے ہیں، جو نہ صرف متاثرہ فرد کو نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ انسان اور حیوان کے فرق کو مٹاتے ہیں۔ یہ کہانی اس بات کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ سماج میں جنسیت صرف ایک ذاتی تجربہ نہیں بلکہ ایک سماجی مسئلہ بھی ہے۔ جنسی استحصال کو انفرادی فعل کے بجائے ایک سماجی رویے کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسانی رویوں اور معاشرتی ڈھانچے کی خامیوں کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی طرح مصنف نے افسانہ "کفارہ" میں جنسی جذبات کی کشمکش اور ان کے دبانے کے نتائج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ کہانی ایک ریٹائرڈ فوجی، خداداد، کی داخلی کشمکش کو بیان کرتی ہے جو بظاہر پنجگانہ نماز کا پابند اور ایک دیندار شخص ہے، لیکن اس کی شخصیت کے اندر چھپی ہوئی خواہشات اسے ایک عجیب الجھن میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

کہانی کا آغاز خداداد کے ایک واقعے سے ہوتا ہے، جہاں اسے ایک عورت، نوری، کی لاش ملتی ہے۔ اس عورت کی لاش کے برہنہ حصے دیکھ کر خداداد کی نظریں ٹھہر جاتی ہیں، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس لاش کے ورثا کو اطلاع دے یا اس صورتحال سے نپٹنے کی کوئی عملی کوشش کرے، وہ اپنی عبادت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ ذہن میں مردہ نوری کے بدن کے خدوخال سوچتا رہا اور ساتھ نماز بھی پڑھتا رہا۔ مصنف خداداد کے اس عمل کو افسانے میں یوں لکھتے ہیں:

> "جب وہ نماز ادا کر رہا تھا، اسے نوری کے سینے کا ابھار، گندمی پیٹ، بھورے سیاہ بال، اور سرد چہرہ برابر یاد آتا رہا تھا، مگر اس نے پوری توجہ نماز پر مرکوز رکھنے کی کوشش کی تھی۔"(۱۰)

یہ عمل خداداد کی شخصیت میں تضاد کو ظاہر کرتا ہے، جہاں وہ ظاہری طور پر ایک نیک شخص ہے لیکن اندر سے اس کی شخصیت کمزوریوں سے بھرپور ہے۔ اس طرح خداداد کے اندر ایک لاشعوری خواہش ابھرنے لگتی ہے جو اس کے ضمیر کو کٹہرے میں لا کھڑا کرتی ہے۔ اگرچہ اس نے نوری کے ساتھ کوئی ظاہری زیادتی نہیں کی تھی اور نہ ہی وہ اس کا قاتل تھا، لیکن اس نے اپنی نظروں کے ذریعے تہذیبی اور اخلاقی حدود کو پامال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ضمیر اسے مسلسل ملامت کرتا رہتا ہے۔ کہانی میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب خداداد ایک خواب دیکھتا ہے۔ اس خواب میں اس کی لاشعور میں چھپی جنسی خواہش کی تکمیل پر جو تسکین حاصل کرتا ہے، یہ تسکین اسے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیتی ہے۔ خواب خداداد کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا ہے اور اسے اپنی اخلاقی گراوٹ کا ادراک ہوتا ہے۔ یہی ادراک اسے اس مقام پر لے آتا ہے جہاں وہ اپنے جرم کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ خداداد کا کفارہ یہ تھا کہ وہ اس عورت، نوری، سے نکاح کرے، جو اب زندہ نہیں رہی تھی۔ یہ فیصلہ خداداد کی نفسیاتی پیچیدگی کو ظاہر کرتا ہے، جہاں وہ اپنے گناہ کا بوجھ اٹھانے کے لیے ایک انتہائی قدم اٹھانے کو تیار ہے۔ افسانے کا اختتام خداداد کے اللہ بخشے سے کیے گئے سوال پر ہوتا ہے: "کیا کسی کی موت کے بعد اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے؟"(۱۱) یہ سوال خداداد کی داخلی کشمکش اور اس کی حقیقت پسندی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات، اندرونی کشمکش اور جذباتی الجھنوں کو گہرائی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار سماجی دباؤ، ماضی کی یادوں اور خواہشات کے تصادم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کے افسانے وجود، اخلاقیات اور انسانی تعلقات جیسے پیچیدہ موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مجموعے "جب تک ہے زمین" کا افسانہ "حقہ، پانی" علامتی انداز میں انسانی خواہشات اور اندرونی تضادات کی عکاسی کرتا ہے۔ کہانی میں غار، ناگ، جھونپڑی، حقہ اور پانی جیسے عناصر انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ داڑھی والے شخص کا کردار نفسیاتی دباؤ کا سبب بنتا ہے جبکہ حقہ پینے کی خواہش ترک کرنے کے باوجود کشش برقرار رہتی ہے، جو اندرونی کمزوری اور تضاد ظاہر کرتی ہے۔ کہانی کا ماحول بے یقینی اور الجھن کا عالم دکھاتا ہے، جہاں خواہشات، خوف اور ضرورتیں انسان کو بے بس کر دیتی ہیں۔ یہ افسانہ فلسفیانہ اور نفسیاتی موضوعات کو خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ جہاں علامتی اور تجریدی عناصر انسانی وجود کی پیچیدگیوں اور اس کے شعوری ولاشعوری پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ کہانی ایک ایسی دنیا کی عکاسی کرتی ہے جو بظاہر غیر حقیقی ہے لیکن اس کے اندر چھپے مفہوم ہر انسان کی داخلی دنیا سے گہرے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی فکر پر ناصر عباس نیر نے افسانہ "یاد اور بھول کا کھیل" میں انسانی نفسیات اور سماجی تعلقات کے پیچیدہ پہلوؤں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ افسانے میں مرکزی کردار کی گفتگو اور خیالات کے ذریعے انسان کے اندر کی کشمکش، اخلاقی سوالات اور یادوں کے اثرات کو بہت عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔ افسانے میں اخلاقی و نفسیاتی سوالات کی کھوج کی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسان کو کسی کی زندگی بچانے یا لینے کا موقع ملے تو وہ کس اصول کے تحت فیصلہ کرے گا؟ مرکزی کردار اپنے دوست شہریار سے بحث کرتے ہوئے مختلف حالات میں قتل کے جواز بیان کرتا ہے۔ اس میں بہت سی نفسیاتی گہرائیاں چھپی ہوئی ہیں، جیسے کہ ماضی کی یادیں، دل میں پھیلی نفرت، یا ایک لمحے کی نفسیاتی حالت جس میں کسی کو نقصان پہنچانا معقول لگتا ہے۔

انسان کسی جان لینے کے لیے یاد اور بھول دونوں کے کھیل میں پھنس کر سامنے والے کی زندگی کا فیصلہ کرتا ہے دراصل "یاد اور بھول کا کھیل" ہی اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ مرکزی کردار نے اپنی زندگی کی مختلف یادوں کی بنیاد پر فیصلہ کرتا ہے کہ وہ کس کو قتل کرے گا؟ یہ یادیں اس کی زندگی کے اہم لمحات ہوتے ہیں۔ ان کے اثرات اس کے موجودہ فیصلوں پر پڑتے ہیں۔ مثلاً بندر کا تماشا دکھانے والے کے حوالے سے یاد، چوکیدار کی ظلم کی کہانی اور جو تا مرمت کرنے والے سے گزرے تجربے ان یادوں کی مثالیں ہیں، مرکزی کردار ناسٹلیجیا کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ انہی یادوں کی بنیاد پر وہ کسی کو قتل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر نے کردار کے ذریعے یہ سمجھایا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک انتقام کا جذبہ چھپا ہوتا ہے۔ جو حالات اور تجربات کی بنیاد پر ابھرتا ہے۔ اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان محض حالات اور ماضی کے اثرات سے متاثر ہو کر اپنے فیصلے کرتا ہے، نہ کہ کسی اخلاقی یا منطقی اصول سے۔ افسانے میں دونوں کردار شہریار اور اس کے دوست (مرکزی کردار) کے سوال، جواب اور دلچسپ گفتگو کے ذریعے مصنف نے سماجی مسائل پر بھی تنقید کی ہے۔ چوکیدار کی بیوی پر تشدد، بندر والے کے ساتھ بچپن کا واقعہ، اور دیگر شخصیات کی کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان سب کے ذریعے مصنف معاشرتی ناہمواریوں اور انسانی تعلقات کی بگڑتی ہوئی صورتحال کو اجاگر کرتے ہیں۔

افسانے کا اختتام بہت گہرا اور معنی خیز ہے۔ جہاں مرکزی کردار آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جان لینا یا بچانا دراصل ایک یادوں اور بھول کا کھیل ہے۔ اس میں انسان کے اندر کی پیچیدگیاں اور اس کی یادوں کا کردار بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف نے اس اختتام سے انسان کی بے چینی اور اس کے غیر متوقع ردعمل کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ افسانے کے اختتام میں مرقوم ہے:

" شہریار نے کہا۔ جان لینا اور بچانا، یاد اور بھول کا کھیل ہے! کوئی اس کھیل کو کھلانے والا بھی تو ہو گا۔ دونوں پہلے ہنسے اور پھر سنجیدہ اور ساتھ ہی کسی نامعلوم بات پر رنجیدہ ہوئے۔ "(۱۲)

مجموعی بات کی جائے تو ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اس افسانہ میں انسان کے اندر کی پیچیدگیوں، نفسیاتی جنگوں اور معاشرتی مسائل کو بہت گہرے اور حقیقت پسندانہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ اس میں نہ صرف ایک انسان کی اندرونی کشمکش کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ سماجی تعلقات اور اخلاقی سوالات پر بھی سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے۔ ایسی ہی انسان کی اندرونی اور نفسیاتی الجھنوں پر مبنی افسانہ "آوازیں اور سایہ" ناصر عباس نیر کی تخلیقی اور فکری صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مصنف اس افسانے میں انسانی ذہن کی پیچیدگیوں، یادوں اور وجودی سوالات کو ایک علامتی اور نفسیاتی انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک فرد کی داخلی کشمکش اور روحانی الجھنوں کو فطرت کی آوازوں، سایوں اور پراسراریت کے ذریعے اجاگر کرتی ہے۔ مرکزی کردار کی سوچوں اور ماحول کا غیر متعین ہونا قاری کو ایک منفرد تجربہ فراہم کرتا ہے، جہاں حقیقت اور تخیل، ماضی اور حال کی سرحدیں مدھم ہو جاتی ہیں۔

کہانی کا مرکزی کردار ایک پراسرار آواز کا تعاقب کرتا ہے جو اس کی اندرونی بے چینی، ماضی کی غلطیوں، اور جذباتی کشمکش کی علامت ہے۔ فطرت کے عناصر جیسے کوؤں کی آواز، شیشم کے درخت، اور گلہریاں کردار کی ذہنی کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں اور ایک غیر یقینی ماحول قائم کرتے ہیں جہاں وہ تنہائی اور الجھن محسوس کرتا ہے۔ کہانی کی شاعرانہ اور علامتی زبان قاری کو کردار کی غیر یقینی اور جذباتی حالت کے قریب لے جاتی ہے، جبکہ ماضی کی چیزیں اس کے موجودہ حال پر اثر دکھاتی ہیں۔ پروفیسر شفیق اکبر کے فلسفیانہ مکالمے انسان کے اعمال، عقل، اور روحانی حقیقتوں کے درمیان تضاد کو ظاہر کرتے ہیں، اور زندگی کو ایک عظیم غلطی کے طور پر پیش کرتے ہیں، جسے انسان اپنی محدود فہم کی وجہ سے سمجھ نہیں پاتا۔ افسانے کا اختتام ایک مثبت اور فلسفیانہ نوٹ پر ہوتا ہے۔ جہاں مرکزی کردار اپنی زمین کو انسانوں اور پرندوں کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ یہ اقدام اس کی داخلی کشمکش اور خوف کے خاتمے کی علامت ہے۔ آوازیں اب خوف یا بے چینی کی نہیں بلکہ سکون اور سمجھ کے احساس سے جڑی ہوئی ہیں۔ مصنف لکھتے ہیں:

"میں پروفیسر شفیق اختر کو صرف یہ بتانے گیا ہوں کہ میں نے چند دنوں اس کی بتائی ہوئی آیات کا ورد کیا تھا۔ وہ آوازیں پھر بھی آتی رہیں تھیں اور وہ سایہ بھی۔ البتہ میں نے اس گھر کی چار دیواری گرادی ہے اور چاراکیڑ میں انگور، آم، جامن، سنگترے کے پیڑ نام لگوا دیے ہیں اور وصیت کر دی ہے کہ یہ زمین میرے بیٹے کے نام رہے گی مگر اس کے باغات کے پھلوں پر پرندوں اور راہ گیروں کا حق ہو گا۔ "(۱۳)

"آوازیں اور سایہ" ایک ایسی کہانی ہے جو قاری کو انسانی زندگی کی ان جہتوں پر غور کرنے پر مجبور کرتی ہے جو عام طور پر ہماری روزمرہ کی سوچ سے ماوراہوتی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی جدوجہد خود اپنے اندرونی خوف اور گناہوں سے ہوتی ہے، اور جب وہ ان پر قابو پالیتا ہے تو سکون حاصل کرلیتا ہے۔ ایسا ہی اس کہانی میں دکھایا گیا ہے۔

ناصر عباس نیر کا افسانہ "کھنڈر کی تختی" ایک عمیق تمثیلی تحریر ہے۔ اس افسانے میں انسان کی حرص، بے یقینی اور معاشرتی رویوں پر تنقید کی گئی ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف مادی اشیا کی قدر و قیمت کو سماجی نفسیات کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے بلکہ انسانی عقیدت، دھوکہ دہی اور اجتماعی حماقت کے پہلوؤں کو بھی واضح کرتا ہے۔ کہانی کا بنیادی محور ایک کھنڈر سے برآمد ہونے والی تختی ہے۔ جسے ابتدا میں ایک عام آثار قدیمہ کی شے سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جیسے ہی تختی پر لکھی تحریر کے معانی ظاہر ہونے لگتے ہیں، یہ محض ایک تاریخی دریافت سے بڑھ کر ایک اجتماعی جنون اور منافع بخش کاروبار کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ افسانہ انسانی معاشرے میں سچائی اور افسانویت کی تفریق کو دھندلا کر دینے والے عوامل کو نمایاں کرتا ہے۔

افسانے میں کھنڈر اور تختی سرمایہ داری نظام کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ عجائب گھر کی انتظامیہ جو ابتدا میں علم و تحقیق کے لیے کام کرتی دکھائی دیتی ہے، جلد ہی منافع کمانے والے ادارے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ تختی کی عبارت کا ترجمہ بھی علم کی خدمت کے بجائے کاروباری مقاصد کے تحت کیا جاتا ہے۔ تختی کی حقیقت یہ ہے کہ اس پر سرے سے کچھ لکھا ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ سب دھوکہ دہی اور جھوٹ پر مبنی سماجی رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کس طرح حقیقت کو مسخ کر کے عوام کو گمراہ کیا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ سچ ہو رہا ہے۔ اس تختی کی پانچویں سطر میں لکھا تھا کہ ایک وقت آئے گا، جب لوگ روٹی، عورت، روپے کی خاطر نہیں، اپنی بات منوانے کی خاطر قتل کیا کریں گے اور بات منوانے کے کئی طریقے ہوں گے۔۔۔۔ بات منوانے والوں کے کئی فرقے بن جائیں گے۔ آج یہ سچ ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ ہماری دریافت کردہ تختی کی سچائی کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے؟ عجائب گھر کے کیوریٹر نے اخبارات کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا۔"(۱۴)

دراصل افسانے میں تختی کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو سچائی اور پیش گوئی کے بہانے انسانی سماجی خرابیوں کو نمایاں کرتی ہے۔ مصنف نے یہ بات بھی عیاں کی ہے کہ کس طرح لوگ ماضی کے مبہم یا غیر واضح بیانات کو موجودہ حالات کے جواز کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دراصل معاشرتی اور فکری تقسیم کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے، جہاں لوگ نظریات کو منوانے کے لیے تشدد اور فرقہ بندی کا سہارا لیتے ہیں۔ تختی کو پڑھنے والے ماہرین کے نام صیغہ راز میں رکھنا، علم کو طاقت کے ذریعے قابو میں رکھنے کی علامت ہے۔ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ علم کو کس طرح عوام پر حاوی ہونے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مصنف نے اس افسانے "کھنڈر کی تختی" کے ذریعے انسانی نفسیات، سماجی رویوں اور مادی حرص پر تنقید کی ہے۔ یہ افسانہ قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا

ہے کہ سچائی، علم اور حقیقت کی تعریف کیسے سماجی، سیاسی اور معاشی مفادات کے تابع ہو سکتی ہے۔ یہ افسانہ ناصر عباس نیر کی فکری گہرائی اور ان کی تمثیلی بیان کی مہارت کا عمدہ مظہر ہے۔

مصنف کا افسانہ "اسے عورت نے جنم نہیں دیا" انسانی وجود، معاشرتی رویوں اور انفرادیت کے سوالات کو گہرے فلسفیانہ اور سماجی انداز میں پیش کرتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسا منفرد اور غیر روایتی فرد ہے جو معاشرتی حدود اور روایات سے آزاد دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ، کیونکہ وہ معاشرتی اصولوں اور توقعات سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ یہ کردار اپنی انفرادیت کے ساتھ کہانی کا محور و مرکز ہے اور عام انسانوں جیسا طرزِ زندگی نہیں رکھتا۔ وہ بازار میں آزادانہ گھومتا پھرتا ہے اور ہر گزرنے والا اسے دیکھ کر اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ کوئی اسے جاسوس سمجھتا ہے، کوئی پاگل، کچھ لوگ اسے "یملا" کہتے ہیں، اور بعض اسے بچگانہ ذہنیت کا نفسیاتی مریض قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، یہ کردار نہ صرف اپنے چہرے کے خدوخال بلکہ اپنی پہچان کو بھی پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے، گویا وہ معاشرے کے طے شدہ اصولوں سے انکار کی علامت ہو۔

یہ افسانہ انسانی نفسیات، شناخت، اور سماجی رویوں کی گہری عکاسی کرتا ہے۔ یہ پراسرار کردار معاشرتی حدود اور شناخت کے عام تصور کو چیلنج کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کردار ایک علامتی وجود ہے جو معاشرتی نظام میں موجود جبر، تعصب، اور استحصال کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی عدم شناخت اور بدلتے خدوخال اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ معاشرہ کس طرح انفرادیت کو قبول کرنے کے بجائے اپنے معیارات پر پرکھتا اور رد کرتا ہے۔ لوگوں کو شک گزرا کہ اسے نفسیاتی عارضہ ہے اور علاج معالجے کے بعد ٹھیک ہو جائے گا، تو انہوں نے ماہرین کو دکھایا لیکن ماہرین نے اسے ہر طرح سے جانچنے اور تشخیص کرنے کے بعد کچھ خاص نتائج نہ حاصل کر سکے۔ انہوں نے ایک ایسی رائے دی جو صرف اس ایک کردار سے پورے سماج کے کرداروں کی بھی عکاسی ہوتی ہے اور اسی چونکا دینے والی بات پر افسانے کا اختتام بھی ہو جاتا ہے۔ ناصر عباس نیر اس اختتامی صورتحال کو یوں لکھتے ہیں:

> "ان ماہرین کی عادت ہے کہ جب کسی مشکل چیز کو سمجھ نہیں پاتے تو مفروضہ گھڑتے ہیں۔ انھوں نے یہ مفروضہ گھڑا ہے کہ یہ اصل میں کوئی ایک شخص ہے ہی نہیں۔ کوئی اس کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس جگہ کب سے ہے اور کہاں سے آیا۔ صرف ایک بات اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ بچہ نہیں ہے۔ اس نے صرف ایک ہی کوشش کی ہے اور لگاتار کی ہے کہ کوئی اس کا چہرہ پوری طرح نہ دیکھ سکے۔ وہ مسلسل اپنے چہرے کے خدوخال بدل لیتا ہے۔ چہرے کے نیچے سب ایک جیسے ہیں۔ ان ماہرین نے آخری بات کہنے سے پہلے پورے بازار کا چکر لگایا۔ واپس آ کر کہا کہ وہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کے چہرے کے بدلتے خدوخال عین وہی ہیں جو بازار میں موجود لوگوں کے ہیں۔ وہ واقعی عورت کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے نہ کسی دوسرے سیارے سے آیا ہے۔ یہ زمین سے بھی نہیں نکلا۔"(۱۵)

یہ کردار، جو اپنی شناخت کو بدلتے خدوخال کے ذریعے چھپاتا ہے، اس بات کی علامت ہے کہ معاشرتی نظام میں فرد کی اصل پہچان کو کچل دیا جاتا ہے یا وہ خود اپنی شناخت سے فرار چاہتا ہے۔ اس کے چہرے کے خدوخال بازار میں موجود لوگوں سے مماثلت رکھتے ہیں، اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ کردار دراصل معاشرے کے مختلف رویوں اور افراد کا مجموعہ ہے۔ یہ ایک اجتماعی وجود یا انسانیت کا علامتی عکس بن جاتا ہے۔ جب معاشرہ کسی فرد یا چیز کو سمجھنے میں ناکام ہوتا ہے تو وہ اپنی محدود سوچ اور تعصبات کے مطابق اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اکثر حقیقت سے دور ہوتی ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے "بوڑھے کا قتل" کا موضوع نہایت گہرائی و گیرائی پر مشتمل ہے۔ اس افسانے میں انسانی شعور، ضمیر کی کشمکش اور موت کی فلسفیانہ تفہیم کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف انسانی جذبات کے اندرونی تضادات کو عیاں کرتا ہے بلکہ اس کی زبانی بیان کی گئی منطق قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ افسانے کا بنیادی سوال "بوڑھے کا قتل" اور اس کے جواز پر قائم ہے، لیکن یہ سوال صرف ایک فرد کے فعل کا جائزہ نہیں بلکہ انسانی رویوں، معاشرتی اصولوں اور ضمیر کی پیچیدگیوں کی تفہیم بھی پیش کرتا ہے۔ یہ قتل کو ایک عام مجرمانہ فعل کے بجائے انسانی تجربے کی گہری سطحوں سے جوڑتا ہے، جہاں عمر، تجربہ اور بڑھاپے کے معنی غیر معمولی اہمیت اختیار کرتے ہیں۔ مرکزی کردار کی اندرونی جنگ، قتل کے ارادے اور ضمیر کی مزاحمت کے درمیان، اس افسانے کی روح ہے۔ کردار خود کو مسلسل سوالات کے کٹہرے میں کھڑا کرتا ہے۔ مصنف نے یہ بھی بتانے کی کوشش کہ ہے کہ بڑھاپا محض عمر رسیدگی کا نہیں بلکہ زندگی کی ایک استثنائی حالت کا استعارہ ہے۔ بڑھاپا، موت کو شکست دینے کی مسلسل کوشش ہے۔ اس جدوجہد کو سمجھنے کے لیے وہ حساسیت درکار ہے جو موت کے قریب آنے کا احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ افسانہ ان چند لوگوں کی حالت بیان کرتا ہے جنھوں نے موت کو قریب سے محسوس کیا اور اسے شکست دینے کی کوشش کی۔ یہی تجربہ انہیں انسانیت اور زندگی کے اعلیٰ معنی سمجھنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ "بڑھاپا موت کو مسلسل شکست دیے چلے جانے سے طاری ہونے والی تھکان ہے"[۱۶] جیسے جملے افسانے کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں۔ اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا سوال اٹھانے کا انداز ہے، جو قاری کو محض متن سے آگے جا کر زندگی، موت، اور انسانی شعور پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ تاہم، یہ گہرائی افسانے کو پیچیدہ بھی بناتی ہے، اور کم حساس یا فلسفیانہ ذہن کے قاری کے لیے بعض اوقات گرفت میں آنا مشکل ہو سکتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانہ "نطشے اور مریل گھوڑا" ایک گہرے فلسفیانہ اور علامتی تخیل کا شاہکار ہے جو انسانی وجود، یادداشت، اور علم کے باطنی پہلوؤں پر غور و فکر کرتا ہے۔ افسانے میں ایک عام واقعہ، لائبریری جانا، علامتی سطح پر انسانی ذات، علم کی جستجو، اور تخیل کی گہرائیوں کو دریافت کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کہانی کا آغاز ایک معمولی تجربے سے ہوتا ہے، لیکن جلد ہی راوی کے مشاہدات اور افکار گہرے معنوی پہلو اختیار کر لیتے ہیں۔ لائبریری کو ایک ایسی جگہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جہاں انسانی شخصیت کی مختلف پرتیں بے نقاب ہوتی ہیں۔ مصنف اس بات پر زور دیتا ہے کہ لائبریری، زندگی کے دیگر مقامات کے برعکس، انسان کی اصل شخصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہاں، لوگ ان کتابوں کے ذریعے اپنی حقیقت کے آئینے میں جھانکتے ہیں جو ان کے ہاتھوں میں آتی ہیں۔ کتابوں پر کیے گئے بے ساختہ تبصرے انسان کے حقیقی جذبات اور سوچ کی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانے کا ایک اور اہم پہلو کتابوں کے ساتھ انسان کا رویہ ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

راوی جب ان کتابوں کی تلاش شروع کرتا ہے جو کبھی کسی نے نہیں پڑھیں، تو یہ رویہ انسانی علم کی ان چھپی ہوئی پرتوں کی نمائندگی کرتا ہے جو عام طور پر نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ ان غیر مستعمل کتابوں کی موجودگی، انسان کے اجتماعی لاشعور اور وقت کے دھارے میں علم کے نظر انداز ہونے کا استعارہ بن جاتی ہے۔ کتابوں کی "خاموشی کی قبر" کو کھولنا، راوی کی اس جستجو کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ان تجربات اور حقائق کو دریافت کرے جو عام انسانی توجہ سے محروم رہ گئے ہیں۔

افسانے میں نطشے اور مریل گھوڑے کا ذکر، انسانی ہمدردی اور ظلم کے بیچ ایک گہرے تعلق کی نشاندہی کرتا ہے۔ نطشے کا وہ تاریخی لمحہ، جب اس نے گھوڑے کی گردن میں بانہیں ڈال کر اپنی ہمدردی کا اظہار کیا، ایک علامتی واقعہ ہے جو انسانی جذبات کی گہرائیوں کو بیان کرتا ہے۔ راوی جب ماضی کے اس گھوڑے کو موجودہ وقت میں دیکھتا ہے تو وہ حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، وہ اس راز میں مداخلت نہیں کرتا جو نطشے اور گھوڑے کے درمیان محفوظ ہے۔ یہ لمحہ حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک پل کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، جہاں تاریخ اور موجودہ وقت آپس میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ کہانی کے اختتام پر، جب راوی کو ایک پرانی کتاب میں نطشے کے گھوڑے کی تصویر ملتی ہے، تو یہ ایک علامتی لمحہ بن جاتا ہے۔ یہ تصویر حقیقت اور تخیل کے درمیان تعلق کو ظاہر کرتی ہے، اور اس بات پر زور دیتی ہے کہ تخیل کی دنیا اور مادی حقیقت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے میں شامل ہیں۔ مصنف یہاں اس صورتحال کی عکاسی یوں پیش کرتا ہے:

> "میں نے جغرافیے کی ایک کتاب حاصل کی۔ وہ سو برس پہلے لائبریری میں پہنچی تھی۔ اسے سٹاک چیکنگ کے لیے ہاتھ ضرور لگتے رہے تھے، کسی قاری کی نظر اس پر پڑی تھی نہ اس کا لمس اس کی قسمت میں آیا تھا۔ کسی نے اسے مسترد بھی نہیں کیا تھا۔ میں اس کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس میں سے ایک تصویر گری۔ بلیک اینڈ وائٹ کسی یورپی مصور کی بنائی ہوئی۔ یہ اس گھوڑے کی تصویر تھی، جس کی گردن میں نطشے نے بانہیں حمائل کی تھیں اور جو اس کے آنسوؤں اور سسکیوں کا امانت دار تھا، اور جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے باہر دیکھا تھا۔ اس مصور کی تصویر اور میری خیالی تصویر میں فرق تھا۔ یہ فرق کاغذ کے سبب تھا۔ خیالی تصویریں کاغذ تک آتے آتے کچھ بدل جاتی ہیں۔"(۱۷)

ناصر عباس نیر اس افسانے میں انسان کے شعوری اور لاشعوری تجربات کو لائبریری، کتابوں، اور نطشے کے گھوڑے جیسے علامتی عناصر کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ یہ افسانہ قاری کو دعوت دیتا ہے کہ وہ انسانی وجود، ہمدردی، علم اور تخیل کی گہرائیوں میں جھانکے، اور ان سوالات کا سامنا کرے جو بظاہر معمولی نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں انسانی زندگی کے بڑے فلسفے کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی نوعیت کے منفرد فکری اور فلسفیانہ پہلوؤں لیے مصنف کا ایک اور افسانہ ''خواب سگاں'' بھی ہے۔ اس افسانے میں ایک مجلس کے دوران کتوں کی عادات واطوار اور ان کی خصوصیات پر گفتگو کے دوران راوی پر یہ ذمہ داری عائد کی جاتی ہے کہ وہ ملک سراج کے فارم ہاؤس میں موجود نایاب نسل کے کتوں کے ساتھ وقت گزار کر یہ دریافت کرے کہ وہ کیا خواب دیکھتے ہیں۔ اس غیر معمولی مشن کے لیے راوی کے لیے

لازم قرار دیا جاتا ہے کہ وہ پہلے اپنے خوابوں سے مکمل طور پر دستبردار ہو۔ طویل جدوجہد کے بعد، وہ اپنے اندر کے خوف پر قابو پاتے ہوئے کتوں سے قربت کا ایک ایسا مرحلہ طے کرتا ہے جو نہ صرف اس کی فکری وسعت کا امتحان ہے بلکہ اس کی جذباتی حد بندیوں کو بھی چیلنج کرتا ہے۔ بالآخر، وہ ان خوابوں کو، جنہیں اس نے سو صفحات پر قلمبند کیا، ملک سراج کے سپرد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ملک سراج ایک ایسا پراسرار کردار ہے جسے جاسوس کہا گیا ہے اور جس کے فارم ہاؤس پر بڑے بڑے وزیر اور مشیر بھی حاضر ہوتے ہیں۔

عصر حاضر میں، استعمار زدہ افراد کے خواب اگر ان کی اپنی ملکیت میں رہیں تو وہ انہیں زندگی گزارنے کے متبادل راستے دکھا سکتے ہیں، یک جہتی حقیقت کے جبر کو توڑ سکتے ہیں اور انہیں تشدد سے نجات دلا سکتے ہیں۔ لیکن یہ آزادی اور تخلیقیت کسی بھی صورت میں مقتدر قوتوں کے مفاد میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خواب سگاں" کا راوی اپنی تحریر کردہ خوابوں کی نقل کسی قیمت پر حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ خواب ایک استعماری نظام کے خلاف مزاحمت کی علامت بن سکتے ہیں، اور ایسے کسی بھی امکان کو دبانا ہی اس نظام کی بقا کا ضامن ہے۔

ناصر عباس نیر کا افسانہ ''ہو سکتا ہے یہ خط آپ کے نام لکھا گیا ہو'' بھی اپنی موضوعاتی اور فکری لحاظ سے الگ پہچان رکھتا ہے۔ افسانہ میں ایک خط کے ذریعے قاری کے ساتھ ایسا مکالمہ ترتیب دیا گیا ہے جو نہ صرف ذاتی تجربات کی حدود کو چھوتا ہے بلکہ آفاقی معانی کے دائرے میں بھی قدم رکھتا ہے۔ دراصل خط، جو انسانی جذبات کے اظہار کا قدیم ترین وسیلہ ہے، لیکن یہاں وقت و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر معنی کے نئے جہان تخلیق کرتا ہے۔ افسانے کی ساخت اپنی نوعیت میں بالکل منفرد اور تازگی سے بھرپور ہے۔ کہانی کا آغاز کتابوں کی محبت اور پرانی اشیاء کی یادوں کے ہلکے پھلکے جذبات سے ہوتا ہے، جو قاری کو ایک نرم، مانوس فضا میں لے آتا ہے۔ لیکن جیسے ہی خط کی پرتیں کھلتی ہیں، کہانی قاری کو سماجی تاریکی اور انسانیت کے پوشیدہ زخموں کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ انکشاف افسانے کو ایک چونکا دینے والے موضوع کی جانب موڑ دیتا ہے، جہاں سماج کی منافقت، ظلم اور جبر کی پرتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔

ناصر عباس اس افسانے میں جرم کی جڑوں تک پہنچنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ صرف سزا دینا انسانی جبلتوں کو قابو میں لانے کا حل نہیں ہے۔ عصمت دری جیسے حساس اور تکلیف دہ مسئلے کو سماجی رویوں اور حکومتی ناکامیوں کے آئینے میں دکھایا ہے۔ مصنف کے نزدیک محض سزا سے جرم دبایا نہیں جا سکتا، کیونکہ انسانی فطرت عبرت سے زیادہ نقل پر مائل ہوتی ہے۔

کہانی میں خواجہ سرا کا کردار بطور علامت سامنے آتا ہے۔ جو انسانی تجسس، جنسی جبلت اور سماجی منافقت کے پیچیدہ دھاگوں کو عیاں کرتا ہے۔ خواجہ سرا کی برہنگی ایک ایسا منظر تخلیق کرتی ہے جو معاشرتی اقدار اور جبلتوں کے تضاد کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ کردار معاشرتی رویوں اور جنسی استحصال پر ایک گہرا سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے، جو قارئین کو انسانی نفسیات کے تاریک گوشوں پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ افسانے کی سب سے بڑی خوبی اس کا فکری اور علامتی اسلوب ہے۔ مصنف نے خواجہ سرا کے کردار کے ذریعے جنسیت اور جنسی استحصال کے گرد بنی سماجی منافقت کو عریاں کر دیا ہے۔ افسانے کا وہ منظر جہاں انسانی مجمع درحقیقت درندوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے، انسانی فطرت کے تاریک ترین گوشوں کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے کے اختتام پر ایک تلخ حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے، جو ہمیں ہمارے معاشرتی رویوں، قانونی نظام اور انسانی جبلتوں کے خلاف آئینہ دکھاتا ہے۔

ناصر عباس نیر نے باقی کئی موضوعات اور افکار کی طرح متصوفانہ رنگ افسانہ ''تیسرا دروازہ'' میں پیش کیا ہے۔ اس افسانہ میں انسانی زندگی کے فلسفیانہ اور روحانی پہلوؤں کو علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی بظاہر جنت اور جہنم کے دروازوں پر مرکوز ہے، لیکن اس کے پس پردہ انسانی نفسیات، روحانی سفر اور حقیقت کی تلاش کے موضوعات پوشیدہ ہیں۔ افسانے میں تیسرا دروازہ ایک علامت ہے جو روایتی جنت اور جہنم کے بیانیوں سے ماورا ایک نئی سوچ یا نئی حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ دروازہ انسان کی اپنی ذات کی گہرائیوں اور ان دیکھے امکانات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو کہ عمومی سماجی یا مذہبی بیانیے میں نمایاں نہیں ہوتے۔ جنت اور جہنم کے دروازے اس دنیا کی روایتی خواہشات اور خوف کی علامت ہیں، جہاں انسان اپنی زندگی کو یا تو انعام کے حصول یا سزا کے خوف میں بسر کرتا ہے۔ لیکن تیسرا دروازہ ان دونوں سے آگے کا راستہ دکھاتا ہے، جہاں مقصد صرف جیت یا ہار نہیں، بلکہ خود شناسی اور معنویت کی تلاش ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> "میں نے ایک بار جنت کے دروازے سے گزرنے کی جاں توڑ کوشش کی تھی، مگر وہ دھکم پیل تھی کہ پسلی تڑوا کر واپس آ گیا۔ یہاں جس کو دیکھو، اس ایک دروازے سے گزرنا چاہتا ہے۔ جانتے ہو، کیوں؟ نہیں۔ اس لیے کہ یہ سب جنت حاصل کرنا نہیں چاہتے، مقابلہ جیتنا چاہتے ہیں۔ دھکم پیل مقابلے کے سوا کہاں ہوتی ہے؟ خیر، کیا تم نے کسی کو جہنم کے دروازے سے گزرتے دیکھا ہے؟ نہیں۔۔۔۔ تم جس تیسرے دروازے کی بات کر رہے تھے، وہ کب کھلے گا اور کہاں؟ اس نے سوال دہرایا۔ جب یہ دونوں دروازے بند ہو جائیں گے تو تیسرا دروازہ کھلے گا۔ یہ بند کیسے ہوں گے؟ اس نے ایک نیا سوال کیا۔ جب تک تیسرا دروازہ نہیں کھلتا، یہ بند نہیں ہوں گے۔"(۱۸)

افسانے میں دھکم پیل اور جنت کے دروازے سے گزرنے کی کوشش انسانی معاشرت کی ان کمزوریوں کو ظاہر کرتی ہے، جہاں لوگ مقصد کو سمجھنے کے بجائے محض مقابلہ بازی اور برتری کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔ یہی کشمکش، معاشرتی دھارے میں انسان کی روحانی ترقی کو روک دیتی ہے۔ دوسری طرف، جہنم کے دروازے کے ذکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنی ناواقفیت میں ہی اپنے ساتھ اپنی ناکامیوں اور مایوسیوں کا بوجھ لادتا ہے۔ تیسرے دروازے کا تصور، جو ان دونوں دروازوں کے بند ہونے کے بعد کھلے گا، اس بات کی علامت ہے کہ جب تک انسان ان عمومی خواہشات اور خوف سے آزاد نہیں ہوتا، اسے نئی حقیقت اور آزادی تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ دروازہ ایک نئے نقطہ نظر، ایک نئی سوچ، اور ایک نئی زندگی کی علامت ہے جو انسان کی داخلی تلاش سے ممکن ہوتی ہے۔ ناصر عباس نیر نے اس افسانے میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے ایک گہرا فلسفیانہ پیغام پیش کیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک غیر روایتی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے جو سماجی اور مذہبی بیانیوں سے بالاتر ہو کر انسانی خود شناسی اور روحانی ترقی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے چوتھے افسانوں کے مجموعے "راکھ سے لکھی گئی کتاب" میں شامل افسانہ "موت کا روبار ہے" میں انسانی زندگی کی بے قدری، معاشرتی بے حسی اور سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقی گراوٹ کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ میں ایک

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

ایسے سماجی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جہاں انسانی المیوں کو صرف اعداد و شمار کی شکل میں دیکھا جاتا ہے۔ بم دھماکوں کے نتیجے میں مرنے والوں کی تعداد، ان کے نام و نشان کی گمشدگی، اور سرد خانے میں رکھی لاشوں کی بے توقیری معاشرتی بے حسی کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ رویے نہ صرف انسانی جذبات کی موت کی علامت ہیں بلکہ یہ اس بات کا ثبوت بھی ہیں کہ کس طرح جدید دنیا میں موت بھی کاروبار بن چکی ہے۔

افسانے کا ایک اہم موضوع سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید ہے۔ جہاں موت کو بھی ایک کاروبار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کہانی میں لاشوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا بے حسی پر مبنی رویہ، دھماکوں سے فائدہ اٹھانے والوں کا ذکر، اور میڈیا کی دلچسپی کا صرف تشہیری مقاصد تک محدود رہنا اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ معاشرہ اخلاقی دیوالیہ پن کی کس حد تک پہنچ چکا ہے۔ میڈیا، جو عوام کی آواز بننے کا دعویٰ کرتا ہے، نہ حقائق کو سامنے لانے کی جرات کرتا ہے اور نہ ہی مظلوموں کی دادرسی میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کا مقصد محض لاشوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنے تجارتی مفادات حاصل کرنا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے انسانی معاشرت کو نہ صرف اخلاقی زوال کی گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے بلکہ انسانیت کے جذبات کو بھی ماند کر دیا ہے۔ لالچ، طمع، اور حرص نے انسانوں کو اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ دولت کمانے کی دوڑ میں وہ انسانیت کے بنیادی اصولوں کو روندنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ افسانے کا اختتام صحافی کے لیے ایک دھمکی اور اس کے فولڈر میں محفوظ کہانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ سچائی کو سامنے لانے والے خود خطرے میں ہیں۔ یہ حصہ اس خوفناک حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جو لوگ موت کے کاروبار کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں بھی خاموش کر دیا جاتا ہے۔ یہاں صحافت بھی قید میں دکھائی گئی ہے۔ اس صورت حال کو مصنف نے افسانے کے اختتام میں یوں پیش کیا ہے:

> "بی بی! پہلی بات: سٹوری کرنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ بہتر ہے آپ رسالوں کے لیے کہانیاں لکھا کریں۔ دوسری بات: تمھاری سٹوری کا آخری حصہ اگرچہ کل کی لیڈ بن سکتا ہے، مگر ہمیں اپنا اخبار اور جان دونوں عزیز ہیں. ایڈیٹر کا جواب کچھ زیادہ توقع کے خلاف نہیں تھا۔ اس نے چپ چاپ یہ سٹوری اس فولڈر میں منتقل کر دی، جسے اس جیسی کہانیوں کے لیے اس نے بنا رکھا تھا۔ لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہیں یہ فولڈر بھی فراموشی کا غار نہ ثابت ہو!"(۱۹)

یہ افسانہ نہ صرف انسانی زندگی کے فلسفے اور موت کی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ قارئین کو ان کے رویوں اور معاشرتی اقدار پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ یہ ایک تلخ مگر حقیقی بیانیے پر مبنی کہانی ہے جو انسانی جذبات، اخلاقی زوال، اور سرمایہ دارانہ نظام کی پیچیدگیوں پر شدید تنقید کرتی ہے۔

ناصر عباس نیر اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات، افکار اور نظریات کی گہری آمیزش پیش کرتے ہیں۔ ایسا ہی ان کا ایک افسانہ "دریا، بستی اور قانون کی کتاب" ان کے افسانوں کے پانچویں مجموعے "جب تک ہے زمین" میں شامل ہے۔ اس افسانے میں انسانی زندگی، قوانین اور ان کے اخلاقی و وجودی پہلوؤں پر سوالات اٹھائے گئے ہے۔ کہانی مختلف علامتوں کے ذریعے انسانی شعور، اختیار اور تقدیر کے معاملات کو واضح کرتی ہے۔ دریا کو زندگی کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو مسلسل حرکت میں ہے، مگر کچھ مقامات پر ایسا

لگتا ہے جیسے رک کر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ دریا کی وسعت اور پیچیدگی انسانی زندگی کے لاتعداد پہلوؤں کی نمائندگی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ افسانے میں کشتی کو ایک عبوری مرحلے یا انسانی شعور کی سطح پر تبدیلی کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ یہ انسان کے سفر، اس کی بے یقینی اور اس کی روحانی تلاش کی نمائندگی کرتی ہے۔ کشتی کا اچانک غائب ہونا اس بات کی علامت ہے کہ حقیقت اور خیال کے درمیان سرحد دھندلی ہے۔ قانون کی کتاب ایک طاقتور علامت ہے جو انسان کے بنائے ہوئے اور غیر مرئی قوانین کے درمیان فرق کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسا ماخذ ہے جو ہر فرد کو معلوم نہیں، لیکن ہر شخص کو اس کی اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ مصنف اس علامت کے ذریعے انسانی قوانین کی غیر منطقی فطرت اور ان کے اطلاق پر سوال اٹھاتا ہے۔ ملاح ایک خاموش نگران کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، جو دریا کے ذریعے انسانی سفر کی نگرانی کرتا ہے لیکن گفتگو نہیں کرتا۔ یہ کردار ایک رہنما کی نمائندگی کرتا ہے جو انسان کو راستہ دکھاتا ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کرتا۔ قانون کا نگہبان اس بات کی علامت ہے کہ قانون ایک غیر مرئی طاقت ہے، جو ہمیشہ موجود رہتی ہے اور صرف ضرورت پڑنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ عدالت کا جج انصاف کے نام پر بے رحمی کی نمائندگی کرتا ہے، جہاں انسانی دلائل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ افسانے میں مصنف اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ زندگی قوانین، ضوابط، اور انسان کے اپنے فیصلوں کا ایک پیچیدہ جال ہے۔ ان قوانین کا علم ہونا یا نہ ہونا، دونوں صورتوں میں انسان ان کے اثرات سے بچ نہیں سکتا۔ افسانہ قاری کو ایک گہرے فکری تجربے میں مبتلا کرتا ہے، جہاں وہ زندگی، قوانین، اور ان کی معنویت پر غور کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک خوبصورت فلسفیانہ سفر ہے، جو قاری کو اپنے وجود کے معنی تلاش کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے ان منطقوں میں قدم رکھتے ہیں جہاں مابعد نو آبادیاتی باشندوں کی رسائی یا تو ممکن ہی نہیں ہوتی، یا اگر ممکن ہو بھی تو ان منطقوں کی حقیقت کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کا حوصلہ اکثر مفقود ہوتا ہے۔ ان کے افسانے، ''اپنے ماضی کے خدا''، خرخشاں نمود''، ''ملبے کا بزنس''، ''پہلے کھیلی اور بعد میں لکھی گئی تمثیل''، ''لوگو فوبیا''، ''خاموشی کا سر'' وغیرہ ایک ایسے ہی فکری اور تخلیقی کینوس کی تشکیل کرتے ہیں جہاں قاری کو غیر محسوس انداز میں ایک گہرے مکالمے میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ ان کے افسانے صرف ایک بیانیہ کے ظاہری پہلوؤں تک محدود نہیں رہتے بلکہ ان کی تہہ میں پوشیدہ اور پیچیدہ سوالات کو بھی چھیڑتے ہیں، جن پر عام طور پر بات کرنا بھی مشکل محسوس ہوتا ہے۔ بسا اوقات کہانی میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک بیان کنندہ کی بات کو کوئی دوسرا کردار کسی نئے زاویے اور مختلف معنی کے ساتھ دہراتا ہے۔ بعض مواقع پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کہانی میں بیان کنندہ تو صرف ایک ہی ہے، لیکن وہ کسی حتمی بات یا قطعی نتیجے تک پہنچنے سے گریز کرتا ہے۔ وہ کہانی کو اس طرح تشکیل دیتا ہے کہ معنی ایک مسلسل التوا میں رہتا ہے، قاری کو یہ آزادی ملتی ہے کہ وہ اپنی تفہیم کے مطابق کہانی کے مختلف پہلوؤں کو کھوجتا رہے۔ یہ عدم قطعیت مصنف کے افسانوی فن کا خاصہ ہے۔

ان کے افسانوی اسلوب کی یہ خاصیت نہ صرف قاری کو موجودہ سماجی اور سیاسی نظام کے غیر محسوس جبر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ ان جابرانہ بیانیوں کے مقابل متبادل بیانیے تخلیق کرنے کے لیے بھی راہ ہموار کرتی ہے۔ ان کا بیانیہ ایک ایسے فکری مکالمے کی بنیاد رکھتا ہے جو نہ صرف انسانی شعور کو نئے امکانات سے روشناس کراتا ہے بلکہ قاری کو اس قابل بھی بناتا ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنے معاشرے اور اپنے گرد و پیش کے ماحول اور نظام سے تجزیہ کر سکے۔ وہ علامتوں، استعاروں اور تجریدی زبان کے استعمال سے کہانیوں کو نہ

صرف گہرائی بلکہ ایک نئے معنوی تجربے سے آراستہ کرتے ہیں۔ ناصر عباس نیر ماضی، حال اور مستقبل کی ان پیچیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں، جن کے ذریعے انسانی شخصیت کی تشکیل میں مختلف عوامل اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے افسانے ہمیں اس بات کا شعور دیتے ہیں کہ انسان نہ صرف اپنے داخلی مسائل کا مجموعہ ہے بلکہ وہ سماجی، سیاسی، اور ثقافتی اثرات کے نتیجے میں بھی اپنی شناخت تشکیل دیتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے کئی جملے ایک شعر کی طرح ایک مکمل موضوع رکھتے ہیں، اور اگلے جملے میں ایک نیا موضوع سامنے آجاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں کئی واقعات اور موضوعات شامل ہوتے ہیں، جن میں ہر واقعہ اپنی جگہ پر ایک مکمل کہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعات بظاہر الگ الگ محسوس ہوتے ہیں لیکن افسانے کی مجموعی بنت میں گہری ہم آہنگی کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں، یوں وہ کہانی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ناصر عباس نیر کا اسلوب ایک افسانے میں محض ایک کہانی سنانے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ ایک کہانی کے اندر کئی چھوٹی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ یہ کہانیاں نہ صرف ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہیں بلکہ بنیادی کہانی کا اہم جزو بھی بن جاتی ہیں۔ ان کا یہ انداز افسانے کے کسی ایک مرکزی نکتے کے تصور کو چیلنج کرتا ہے۔ اگر ایک افسانے میں ایک ہی بیان کنندہ ہو، تو وہ بھی ایک واقعے کو مختلف زاویوں سے دیکھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ناصر عباس نیر خوابوں، واہموں، توہمات اور اساطیری قصوں کو اپنے افسانوں میں اس مہارت سے شامل کرتے ہیں کہ وہ حقیقت نگاری کے روایتی تصور کو نئے معنوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب حقیقت اور تخیل کے درمیان ایک پل تعمیر کرتا ہے، جس کے ذریعے سے وہ کہانی کی گہرائی اور پیچیدگی کو مزید اجاگر کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیر کے افسانوں کی تخلیق میں جو خیالات اختیار کیے ہیں، وہ عموماً ان کے ذاتی تجربات اور اپنے ماحول سے اخذ شدہ ہیں۔ انہوں نے پنجاب کی لوک حکمت، اس کے مروجہ افکار، اور پنجابی اصطلاحات کو جس مہارت سے اپنے افسانوں میں استعمال کیا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس کی بدولت یہ افسانے پڑھتے وقت قاری میں ایک گہری اپنائیت اور ہم آہنگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسی تحریر، جو قاری کو ان گہرے رازوں سے آشنا کرے جو وہ کسی سے بھی آگے نہیں چاہتا، در حقیقت ایک عظیم اور شاندار تحریر ہوتی ہے، اور یہی ادب کا حقیقی مقصد ہے جسے یہ تحریر سچ میں پورا کرتی ہے۔ یہ افسانے نہ صرف زبان اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ اس بات کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ لفظ کی حقیقت اور بول چال کی قوت کس طرح ایک نئی جہت فراہم کرتی ہے۔ اردو ادب میں اس نوعیت کی تخلیقی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری حقیقتاً اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف افسانہ پڑھنے کا مزہ لے بلکہ اسے مکمل طور پر سمجھ بھی سکے۔ یہ افسانے دراصل اس فرق کو واضح کرنے میں کامیاب ہیں جو افسانے اور کہانی کے درمیان موجود ہوتا ہے، حالانکہ یہ فرق کئی عالم و فاضل افراد نے اپنی تنقیدی تحریروں میں بیان کیا ہے، لیکن ان کی پیچیدگیوں کی وجہ سے عام قاری تک اس کا مفہوم نہیں پہنچ پاتا۔ اس کے برعکس، ان افسانوں کو پڑھ کر قاری خود بخود اس فرق کو سمجھنے لگتا ہے اور اس کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔

ناصر عباس نیر کے افسانے محض کہانیاں نہیں بلکہ ایک فکری و شعوری تجربہ ہیں، جو قاری کو بیانیے کی طاقت اور اس کے ممکنہ نتائج کے حوالے سے نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کی یہ تکنیک ادب کے وسیلے سے انسانی ذہن کو آزادی کے نئے راستے دکھاتی ہے اور معنی کی تکثیریت کو تسلیم کرتے ہوئے استبدادی اور استعماری بیانیوں کے مقابل ایک مضبوط فکری مزاحمت قائم کرتی ہے۔ ان کی تحریریں زندگی کے مختلف پہلوؤں، انسانی نفسیات، اور معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے افسانے سماجی، سیاسی، اور تہذیبی مسائل کو نمایاں کرتے ہوئے طبقاتی تفریق، سماجی ظلم و ستم، اور ثقافتی زوال جیسے موضوعات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ انسانی احساسات، تنہائی اور جذباتی کشمکش کو گہرے فلسفیانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مابعد نو آبادیاتی شعور کی جھلک ملتی ہے، جہاں شناخت کے بحران اور استحصال جیسے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ وجودیت کے فلسفے کے تحت وہ زندگی کے بے معنی پہلوؤں پر سوال اٹھاتے ہیں اور اپنے کرداروں کی کہانیوں کے ذریعے وجود کی تلاش کا بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مروجہ روایات اور بیانیوں کو چیلنج کرنے کی جھلک بھی نمایاں ہے بلکہ وہ ایک نیا بیانیہ بھی تخلیق کرتے ہیں، جو ان کی ساخت شکن سوچ کی عکاسی کرتی ہے۔

ناصر عباس نیر افسانوں میں بین المتونیت کی تکنیک کے ذریعے ایک منفرد رجحان پیش کرتے ہیں۔ ان کی افسانوی تحریریں مختلف متون کے درمیان تعلقات کو دریافت کرنے اور عصری مسائل پر غور و فکر کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ان کے افسانے جمالیاتی حسن اور فکری گہرائی کا امتزاج ہیں، جہاں ابہام اور لایعینت قاری کو متن کے معانی تلاش کرنے کی منفرد جدوجہد میں شامل کرتے ہیں۔ ان کے افسانے قارئین کو محض تفریح فراہم کرنے کے بجائے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں اور انہیں زندگی کے پیچیدہ سوالات سے روشناس کراتے ہیں۔ اس طرح، ناصر عباس نیر کے افسانے اردو ادب میں فکری تحریک اور موضوعاتی تخلیقی اظہار کا ایک شاندار امتزاج پیش کرتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ناصر عباس نیر، پرانا اور نیا نظام انصاف، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۳۲
۲۔ ناصر عباس نیر، لکھنا بھی سزا ہے، پر آدمی ہونا بڑی سزا ہے، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۶۶
۳۔ ناصر عباس نیر، پروشاسی، کروفر، فروشاسی، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۴۵
۴۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر، سلیم الرحمان، مرتبہ: منتخب ادبی اصطلاحات، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۱۲۱
۵۔ ناصر عباس نیر، تمہارا قانون، مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۶
۶۔ ناصر عباس نیر، گڑ اور گولیاں، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۱۴۸
۷۔ ناصر عباس نیر، عورت کو زیادہ محبت کس سے ہے؟ مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۲۲
۸۔ ناصر عباس نیر، ولدیت کا خانہ، مشمولہ: خاک کی مہک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۵۷
۹۔ ناصر عباس نیر، درخت باتیں ہی نہیں کرتے۔۔۔۔۔، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۱۰

۱۰۔ناصر عباس نیر، کفارہ، مشمولہ: خاک کی مہک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۱
۱۱۔ایضاً، ص ۴۷
۱۲۔ناصر عباس نیر، یاد اور بھول کا کھیل، مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۴۶
۱۳۔ناصر عباس نیر، آوازیں اور سایہ، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۱۱۴
۱۴۔ناصر عباس نیر، کھنڈر کی تختی، مشمولہ: فرشتہ نہیں آیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵۹
۱۵۔ناصر عباس نیر، اسے کسی عورت نے جنم نہیں دیا، مشمولہ: ایک زمانہ ختم ہوا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۰۸
۱۶۔ناصر عباس نیر، بوڑھے کا قتل، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۱۳۶
۱۷۔ناصر عباس نیر، نطشے اور مریل گھوڑا، مشمولہ: جب تک ہے زمین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۵ء، ص ۱۳۶
۱۸۔ناصر عباس نیر، تیسرا دروازہ، مشمولہ: فرشتہ نہیں آیا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۶۶
۱۹۔ناصر عباس نیر، موت کاروبار ہے، مشمولہ: راکھ سے لکھی گئی کتاب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۳ء، ص ۱۱۵

References in Roman Script:

1. Nasir Abbas Nayyar, *Purana Aur Naya Nizaam-e-Insaaf*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.32
2. Nasir Abbas Nayyar, *Likhna Bhi Saza Hai, Par Aadmi Hona Bari Saza Hai*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.66
3. Nasir Abbas Nayyar, *Paroshasi, Karofur, Faroshahi*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.45
4. Mualifeen: Sohail Ahmad Khan, Dr. Saleem Rehman, *Muntakhab Adabi Istilahaat*, GC University, Lahore, 2005, p.121
5. Nasir Abbas Nayyar, *Tumhara Qanoon*, Mashmoola: *Ek Zamana Khatam Hua Hai*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2020, p.16
6. Nasir Abbas Nayyar, *Gur Aur Goliyan*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.148
7. Nasir Abbas Nayyar, *Aurat Ko Zyada Mohabbat Kis Se Hai?*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.22
8. Nasir Abbas Nayyar, *Walidiyat Ka Khana*, Mashmoola: *Khaak Ki Mehak*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2016, p.57
9. Nasir Abbas Nayyar, *Darakht Baatain Hi Nahi Karte...*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.10
10. Nasir Abbas Nayyar, *Kaffara*, Mashmoola: *Khaak Ki Mehak*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2016, p.41
11. Aizan, p.47
12. Nasir Abbas Nayyar, *Yaad Aur Bhool Ka Khel*, Mashmoola: *Ek Zamana Khatam Hua Hai*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2020, p.146

13. Nasir Abbas Nayyar, *Aawazain Aur Saya*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.114
14. Nasir Abbas Nayyar, *Khandar Ki Takhti*, Mashmoola: *Farishta Nahi Aya*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2017, p.159
15. Nasir Abbas Nayyar, *Usay Kisi Aurat Ne Janam Nahi Diya*, Mashmoola: *Ek Zamana Khatam Hua*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2020, p.108
16. Nasir Abbas Nayyar, *Boorhay Ka Qatal*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.136
17. Nasir Abbas Nayyar, *Nietzsche Aur Maryal Ghoda*, Mashmoola: *Jab Tak Hai Zameen*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2025, p.136
18. Nasir Abbas Nayyar, *Teesra Darwaza*, Mashmoola: *Farishta Nahi Aya*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2017, p.166
19. Nasir Abbas Nayyar, *Maut Karobar Hai*, Mashmoola: *Raakh Se Likhi Gayi Kitaab*, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2023, p.115

Mr. Munir Abbas is currently pursuing his PhD in the Department of Urdu at Minhaj University, Lahore, Pakistan. He is the author of one book and has published eleven research articles. He holds an MPhil degree in Urdu Literature from the University of Southern Punjab, Multan, where he secured first position in his studies.

Dr. Munawar Amin serves as an Assistant Professor in the Department of Urdu at the University of Southern Punjab, Multan, Pakistan. She obtained her PhD from Government College University, Lahore, with a specialization in Urdu fiction and research editing. Dr.Amin is the author of one book and has published Thirty-eight research articles.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 18th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.417

مولانا حالی کی اصلاحی فکر اور اقبال کی شاعری: تجزیاتی مطالعہ

Moulana Hali's Reformic Thought and Iqbal's Poetry: Analytical Study

DR. SYEDA TAYYABA RUBAB
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Graduate College for Women, Karkhana Bazar, Faisalabad, Pakistan.
(zakisyed01@gmail.com)

ABSTRACT Moulana Altaf Hussain Hali was a legend literary person. He freed the Urdu ghazal from old themes and introduced it to the larger scope of the diverse segments of life. He was a reformer, who pioneered modern literary attitude in Urdu literature. His poetic vision guided him about the literary revolution in Urdu. He recalled the religious, political and cultural history of Muslims and compared it to present. He wanted to aware the Muslims of subcontinent. Being the companion of Sir Syed Hali was diplomatic but after all he felt the serious and miserable condition of Muslim community in subcontinent and raised his voice in his poetry. Allama Iqbal was inspired by Hali, especially by his masterpiece "masaddas Maddo Jazer Islam" and by some other poems. Religious consciousness has gathered Allama Iqbal and Hali on the same platform Remembrance of glorious part of Muslim Ummah, Islamic golden ages, the sorrow of forgetfulness of our great ancestors, customs and the present condition of Muslim decline were the same reasons which influenced Iqbal and Hali, both, to write such poetry. We can trace Hali's inspiration in the poetry of Iqbal. This article is a comprehensive study of Hali's impacts on Iqbal's poetry.

Keywords Impacts, Past, Iqbal, poem, guide, Western, Tradtion, Civilization.

مولانا الطاف حسین حالی نے اُردو غزل کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اُردو غزل فارسی غزل کی صدیوں پرانی روایات سے اثر پذیر تھی۔ اس نظام غزل کو تبدیل کرنا کارِ دگر تھا جس کے لیے حالی نے مقدور بھر کوشش کی۔ ان کے استاد مرزا غالب کو بھی تنگنائے غزل میں وسعت کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ غزل کے مضامین مختلف ادوار میں تکرار کے باعث پامال ہو چکے تھے۔ "غزل کو نئے افق سے آشنا کرنے میں حالی کی نظری و علمی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"(۱)

حالی اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ غزل ہندوستان کے عوام کے مزاج میں رچ بس چکی ہے مغربی ادب کی پیروی میں اسے ردّ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں تبدیلی ناگزیر ہے یہ ادب برائے زندگی کا نظریہ تھا اس مقصد کے لیے حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" شاعری کی پہلی تنقید قرار پایا۔ "وہ اُردو تنقید کے بانی بھی ہیں اور اُردو کے بہترین نقاد بھی۔"(۲)

حالی نے پہلی بار غزل کی خوبیاں متعین کیں۔ انھوں نے غزل کی اصلاح کے لیے شاعر کے تجربے کو ضروری گردانا۔ ان کے

This work *is licensed under a* Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

نزدیک شاعری اگر تجربے سے نہیں گزری تو نیچرل نہیں ہو سکتی اس کی بنیاد محض روایت پر ہو گی۔ مثلاً عشقیہ مضامین اسی صورت میں نیچرل ہوں گے جب عشق کی واردات شاعر کے قلب پہ گزری ہو، بصورتِ دیگر غزل تاثیر سے عاری ہو گی اور اس میں تصنع پیدا ہو جائے گا۔ حالی نے سادگی، اصلیت اور جوش کو جدید غزل کے لیے ضروری گردانا نیز قوت تخیل حالی کے نزدیک شاعر کی لازمی صفت ہے اس کے بغیر شاعری نیچرل نہیں ہو سکتی۔ حالی چاہتے تھے کہ غزل چند موضوعات میں مقید نہ ہو بلکہ اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے اور غزل کے موضوعات کو وسعت دی جائے اور روایتی نظام علامات سے نکل کر علم بیان کو نئی معنویت سے ہمکنار کیا جائے۔ حالی کے دور میں صرف اکبر الٰہ آبادی تھے جو روایتی غزل کی خامیوں سے مبرا شاعری کر رہے تھے۔ حالی نے اپنی غزل کو بھی جدید اور قدیم، ادوار میں تقسیم کیا۔ حالی اگرچہ جدید غزل کے بہت زیادہ نمونے پیش نہ کر سکے لیکن یہ اُن کی روایت شکنی شاعرانہ اجتہاد اور مقدمہ شعر و شاعری کی صورت میں اردو شاعری کی تنقید کا نقشِ اولین تھا جس نے غزل کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جدید غزل کی سمت متعین کی۔ حالی کی یہ کوشش اور اُن کا کارنامہ آج اکیسویں صدی میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے جس نے جدید غزل کو رواج دیا اور حالی جدید غزل کے بانی ٹھہرے۔ "حالی نے غزل کو تجزیاتی اور واقعاتی شکل میں پیش کیا۔ انفرادیت، جدید شاعری اور حالی کی غزل کی بنیاد ہے جس میں ذات کا تشخص پوری طرح ابھرتا ہے۔"(۳) یہی وہ سمت تھی جس میں آگے چل کر اقبال نے موضوعات کے تنوع سے اُردو غزل کو بامِ عروج تک پہنچایا اور روایتی نظام کو رد کر کے اپنا منفرد اسلوب متعارف کرایا جو نہ صرف عصر جدید بلکہ آنے والے ادوار کے فکر و فن کے لیے بھی ایک معیار ہے۔ اس طرح اقبال حالی سے اثر پذیر ہوئے۔ ڈاکٹر ضیا الحسن کی نظر میں:

> "اقبال کی شاعری حالی کے نظریات کے عین مطابق ہے کیوں کہ انہوں نے نہ صرف غزل کے روایتی نظامِ علامات کو ترک کیا بلکہ اپنے لیے خود ایک نیا نظام علامات وضع کیا جو ان کی فکر کا زایدہ تھا۔ انہوں نے اپنے عہد کے چیلنجز کا سامنا کیا اور زمانے کی راہنمائی کا فریضہ اپنی شاعری کے ذریعے انجام دیا۔"(۴)

حالی کی شاعری کسی جھوٹے عشق کی داستان طرازی نہ تھی۔ حالی ایک بیدار مغز انسان تھے انہوں نے شاعری میں قومی مسائل کو موضوع بنایا اور دہلوی تہذیب جو مسلمانوں کے عروج کی عکاس اور دہلی ہندوستانی علوم و فنون اور شعر و ادب کا مرکز تھی۔ حالی اس میں "نشاطِ نغمہ و مے" ڈھونڈتے رہے اور دہلی مرحوم کا افسانہ کہتے رہے انہوں نے غالب اور حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھا جو دراصل دہلی اور دہلوی تہذیب کے زوال کا مرثیہ تھا۔ غالب کے مرثیے میں حالی نے جہاں غالب کی فنی عظمت اور شخصی بزرگی کا اعتراف کیا ہے وہاں غالب کی تہذیب و تمدنی حیثیت کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے، ان کی سخن وری کے آسماں کے مقابل باقی شعرا کو خاک قرار دیتے ہیں۔ غالب کو دہلی سے خاص نسبت ہے جہاں کچھ عرصہ حالی ان کی شاگردی میں بھی رہے ہیں اور اب آسمان دہلی کے اس تابندہ ستارے کی وفات پر غم کے آنسو بہاتے ہیں۔ حکیم محمود خاں کا مرثیہ عظیم الشّان دہلوی تہذیب کے زوال اور تباہی کا نوحہ ہے جہاں مسلمانوں کے جاہ و جلال کو ہی زوال نہیں آتا بلکہ ان کا علم و ہنر بھی چھین جاتا ہے۔ حالی یونان کے بعد دہلی کو علم و حکمت کا دوسرا مرکز قرار دیتے ہیں۔ تہذیبی زوال کے ساتھ جہاں آباد پر اداسی کے بادل چھا جاتے ہیں اور اس کی محفلیں ویران ہو جاتی ہیں۔ "شاعر دیکھ رہا ہے کہ ایک ایک

کر کے صاحبانِ علم وحکمت رخصت ہو رہے ہیں۔۔۔ دلّی۔۔۔ معدن جواہر دلی روز بروز تہی دست ہوتی جا رہی ہے۔"(۵)

اس تہذیب کی خانقاہیں تاریک اور مدرسے ویران ہو گئے ہیں گویا روحانی اقدار ناپید ہو گئی ہیں۔ حکیم محمود خاں جیسے صاحب علم وحکمت کی رخصت کے بعد دہلی اور دہلوی تہذیب مایوسی کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ حالی نے اپنے مخصوص سوز و گداز کے اسلوب میں جو غم واندوہ کی تصویر کھینچی ہے وہ دراصل حکیم محمود کے پیرائے میں تہذیبی زوال کی داستان ہے۔ اقبال نے بھی مرزا غالب اور مرزا داغ کے مرثیے میں بین السطور دہلوی تہذیب کا مرثیہ کہا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی مسدس "مدوجزر اسلام" کے اقبال کی نظموں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" پر واضح اثرات ہیں۔ ایسا نہیں کہ اقبال نے حالی کی تقلید کی ہے لیکن حالی نے اردو شاعری کو جس منزل تک پہنچا دیا تھا، اقبال اس سے اپنا دامن بچا کر آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ سو اجتماعی شعور زینہ بہ زینہ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا اقبال کو ورثے میں ملا تھا جسے انہوں نے اپنے دل نشیں اسلوب، جوش وولولہ، سوز و گداز اور بلند تخیل سے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔

اردو شاعری میں مسدس حالی کی اہمیت مسلّم ہے یہ پہلی پکار ہے جس نے مسمانوں کو بیدار کیا۔ حالی کے پیش نظر مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت تھی جسے انہوں نے شاعری کے ذریعے بدلنے کی کوشش کی اور اس کے لیے غزل کے بجائے نظم کا انتخاب کیا اور ایسا اسلوب اختیار کیا کہ حالی کی فریاد ملک کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ "یہ وہ نظم ہے جو اردو ادب کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔"(۶)

مسدس حالی، اقبال کی ابتدائی شاعری کے لیے محرک ٹھہری۔ حالی کی آواز میں سوز تھا۔ مسلمانوں کی عروج و زوال کی داستان تھی۔ صداقت تھی، امتِ مسلمہ کے حالِ زار پر نوحہ گری تھی۔ شاعری کے روائتی مضامین سے بغاوت کر کے طرزِ جدید کی ابتدا حالی نے کی، اردو شاعری میں مضامین کی وسعت پیدا کی، پہلی بار ملک وملّت کے مسائل شاعری کا موضوع بنے لیکن حالی کے پاس مسائل کا کوئی حل نہ تھا، انہوں نے قوم کو خوابِ غفلت سے جگانا چاہا لیکن کوئی عملی سمت متعین نہ کر سکے۔ اس کے پس منظر میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی جسے انگریز غدر کا نام دیتے تھے، کی پیدا کردہ صورتِ حال تھی۔ جس میں مسلمان زیرِ عتاب رہے، ان کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ غیر کے تسلّط نے مسلمانوں کو مایوسی اور نا اُمیدی کے اندھیروں میں دھکیل دیا یہ حادثہ مسلمانوں کی اجتماعی شکست آرزو کا سبب بنا۔ مولانا حالی نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان حوصلہ شکن حالات میں مسلمانوں کے عروج کا کو اب دیکھنا یاد کھانا ناممکن نہ تھا سو حالی نے وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا، جو وقت کا تقاضا تھا، جسے نظر انداز کر کے ملت کا اجتماعی شعور اور اردو شاعری ارتقائی منزل طے نہ کر سکتے۔ "قومی ترجمانی کی جس روایت نے حالی کے ہاتھوں جنم لیا اس کی تکمیل اقبال کی صورت میں ہوئی۔"(۷)

حالی نے شاعری کے ذریعے قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ ان کی عظمت رفتہ کا احساس دلایا اور ماضی کی نوحہ گری کی حالی کی شاعری کا موضوع ہندوستانی جاہ جلال اور مقام عروج وزوال نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے عرب پیش از اسلام کا نقشہ کھینچا، عربوں کی جہالت پھر اسلام کی آمد اور نبی آخر الزماں ﷺ کے معجزات اور مدت تک اسلام کے دورِ عروج کا ذکر کیا۔ "اور عصرِ حاضر میں مسلمانوں کا زوال، اس کی وجوہات اور مسلمانوں کی حالت کا زار کا نقشہ کھینچا، حالی نے مسلمانوں کے کھوئے ہوئے عظمت و جلال کو ایسے سوز و گداز اور درد سے بیان کیا ہے کہ اس سے قبل ہماری کسی زبان میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔"(۸)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

اقبال کی نظموں "شکوہ"، "جوابِ شکوہ" میں بھی کم و بیش وہی مضامین ہیں جو مسدس حالی کے تھے۔ اقبال نے بھی مسلمانوں کو عظمتِ رفتہ کا احساس دلایا اور ماضی کی نوحہ گری کی لیکن اقبال کی آواز میں قوت و طاقت کا ساماں تھا۔ وقت کا دھارا تبدیل ہو چکا تھا اقبال کو جو دور ملا اس میں مسلمان دوبارہ عروج کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سو اقبال کے ذہن رسا نے نہ صرف ملّت کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور اس کی نبّاضی کی بلکہ دردِ ملت کا درماں بھی کیا جو حالی نہ کر سکے تھے نہ کر سکتے تھے حالات کی زنجیروں نے افکارِ حالی کو جکڑ لیا تھا لیکن اب وقت آ چکا تھا کہ ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے سو اقبال نے نہ صرف ان زنجیروں کو توڑا بلکہ افکار کو سمت بھی عطا کی اور قوم کے لیے لائحہ عمل بھی تیار کیا خوش امیدی اور جوش و ولولہ اقبال کی دین تھی نیز اقبال کا پیام عالمگیر تھا لیکن بنیادیں حالی نے فراہم کی تھیں جن پر اقبال نے ایسی فکری عمارت تعمیر کی جو کبھی دستبرد زمانہ کی نذر نہیں ہو سکتی۔ "مسدس حالی" اور "شکوہ"، "جوابِ شکوہ" میں بہت سی مشترک خصوصیات ہیں حالی اور اقبال دونوں نے قبل از اسلام کا منظر پیش کیا۔ توحید اور رسالت دونوں کا موضوع ہے۔ دونوں کے بہت سے خیالات بھی مشترک ہیں۔ مسدس حالی اور "جوابِ شکوہ" دونوں کا اختتام عشقِ رسول ﷺ پر ہوتا ہے۔ اقبال نے حالی کے استعارے اور تلمیحات بھی استعمال کی ہیں لیکن اسلوب دونوں شعرا کا منفرد ہے۔ اقبال نے بھی حالی کی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج کو اہمیت نہیں دی۔ وہ عجمی خُم میں حجازی مے پلاتے رہے۔ اگرچہ حالی، سرسید کے اثر میں انگریز کی تعریف کرتے رہے لیکن انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ کے ردِ عمل میں حالی اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کا الگ تشخص اور جداگانہ قومی حیثیت ہونی چاہیے۔ حالی جیسے مصلحت پسند کا اس نتیجے پر پہنچنا قوم کی شعوری ترقی کا ارتقائی زینہ تھا جس کا اظہار حالی کی شاعری سے ہوا مسدس جس دور میں لکھی گئی وہ انگریزوں کی سائنسی ترقی کا دور تھا لیکن حالی نے مسدس میں ثابت کیا کہ مغرب کی علمی و سائنسی ترقی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے۔ انگریزوں نے یہ علوم و فنون مسلمانوں سے لیے تھے جن پر عمل پیرا ہو کے وہ آج دنیا پر حکومت کر رہے تھے اس سے پہلے یہی انگریز ایک وحشی اور غیر مہذب قوم تھی:

بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے
وہ تھے بھیڑیے آدمی خور سارے(۹)

اقبال نے "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں یہی تصور پیش کیا ہے کہ مسلمان ایک عظیم قوم تھے جنہوں نے دنیا کو جہانگیری و جہانبانی سکھائی پھر مسلمانوں کی حکومت کو زوال آ گیا تاہم اقبال کو اصل دکھ اس بات کا تھا:

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ(۱۰)

حالی اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ مغرب کی اندھی تقلید سے مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ "مسدس کا شاعر جب اپنی خودی میں ڈوب کر ابھرا تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی تھی کہ قوم کی اصلاح و ترقی کے لیے مغرب کی اندھی تقلید درکار نہیں اسلام کی ابدی تعلیمات اور تہذیبی اقدار ماضی کی طرح آج بھی ہماری ملّی بقا و ارتقا کی ضامن ہیں۔"(۱۱)

حالی کو یہ عرفان انگریز اور ہندو کے تعصب سے حاصل ہوا یہاں تک کہ وہ مقامی اقوام سے مایوس ہو گئے اور حالی جیسا صلح جُو علیحدگی پسند ہو گیا اس کا اظہار ان کی نظم "شکوۂ ہند" میں ہوا۔ اس نظم میں حالی ہندوستان سے جذباتی ہجرت کرتے ہیں۔

رخصت اے ہندوستاں ، اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی مہماں(۱۲)

اس نظم میں حالی سرزمین ہند سے شکوہ کناں ہیں کہ تو نے ہمیں دولت دی، حکومت دی، سلطنت دی لیکن تم نے انتقام بھی خوب لیا، ہم اور تھے تم اور تھی، ہماری تہذیب اور تھی، تمہاری اور تھی تمہارے ہم پر احسان بھی بہت ہیں لیکن آخر تم نے ہمیں نشانِ عبرت بنا دیا۔ "آگ: زندگی کا سرچشمہ ہے، شاداب ہے، زندگی کی طرح سرخ ہے، سیاہ ہے، سفید ہے، بے قراری ہے، وحشت ہے، جنوں ہے، پرواز کناں ہے، روح کی طرح لطیف ہے، حرارت ہے، قوتِ تخلیق ہے، وجود ہے۔"(۱۳)

ان خصوصیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اقبال کے تصورِ عشق کی بھی کم و بیش یہی خصوصیات ہیں۔ حالی کی اس نظم میں ۱۸۵۷ء کے سیاسی انقلاب، مسلمانوں کی شکست، انگریز کا تسلط اور مسلمانوں سے انگریز کے انتقام کی طرف اشارہ تھا۔ اس نظم میں حالی مسلمانوں کا درد جذباتی سطح پر محسوس کر رہے ہیں جو اجتماعی زندگی میں تعلیمی، سیاسی اور معاشی طور پر تنہا ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر طرف تعصب کے شعلے بھڑک رہے تھے اور مسلمانوں کے پاس کوئی لائحہ عمل نہ تھا۔ عین ممکن ہے اقبال نے بھی مسلمانوں کی اجتماعی فکری و جذباتی تنہائی کو محسوس کر کے کہا ہو "رخصت اے بزم جہاں سوئے چمن جاتا ہوں میں" اقبال کی نظم "شاعر" میں افرادِ قوم جسدِ واحد ہیں اور شاعر اس جسم کی آنکھ ہے جب کوئی عضو درد میں مبتلا ہو تو آنکھ اس کا درد محسوس کرتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو "رخصت اے بزم جہاں" میں اقبال کا احساس تنہائی گویا قوم کے اجتماعی شعور کی عکاسی کر رہا ہے۔ وہ قوم جو مدتوں مقامی اقوام سے باہم شیر و شکر رہی۔ ان کے عقائد و نظریات کا احترام کرتی رہی اور حکمران قوم ہونے کے باوجود انہیں ساتھ لے کر چلتی رہی۔ اب انہیں اقوام میں تنہا ہو کر رہ گئی۔ قوم کا اجتماعی احساس تنہائی شاعر پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کی آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکتا ہے۔ دکھ درد کے اس منظر کو چھوڑ کر اقبال اپنے تخیل کی دنیا آباد کر لیتے ہیں ان کی نگاہِ بصیرت کسی اور منزل کی تلاش میں ہے:

چشم حیراں ڈھونڈتی اب اور نظارے کو ہے
آرزو ساحل کی مجھ طوفان کے مارے کو ہے(۱۴)

اور پھر یہی اقوام دیکھتی ہیں کہ اقبال کی نگاہِ بصیرت مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کی پیش گوئی کرتی ہے جو آگے چل کر سچ ثابت ہوتی ہے اور پاکستان وجود میں آتا ہے۔ یوں حالی نے جس دردمندی کے ساتھ اردو شاعری کو نیا موڑ دیا اور قومی شاعری کی بنیاد رکھی، یہی طرز فغاں اقبال کی آواز میں سنائی دینے لگی اور آگے چل کر اقبال کی پہچان بن گئی۔ اقبال نے "حالی ہی کی طرح بارگاہِ ایزدی میں شکووں اور مناجاتوں کا دفتر پیش کیا اور اس طرح اس تصویر درد کو مکمل کر دیا جس کے خاکے میں حالی نے خونِ جگر کا رنگ بھرا تھا۔"(۱۵)

مختصر یہ کہ حالی کا دور وہ دور تھا جب مسلمان پستی و بدحالی کی انتہا پر تھے۔ اس تاریکی کے بعد طلوعِ سحر ایک لازمی امر تھا۔ اقبال ان اندھیروں میں نویدِ سحر بن کر آئے ان کے ہاں حالی کا سا درد تو ہے لیکن مایوسی نہیں اقبال کا پیغام صرف برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے تھا۔ حالی نے دردِ ملت کی نشان دہی کا جو بیڑا اُٹھایا تھا اقبال نے اسے پار لگایا۔ بلاشبہ حالی نے راستہ ہموار کیا اور ایسی فضا تیار کی جہاں ملّت کا اجتماعی شعور، اقبال کا منتظر تھا۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۳۲

۲۔ کلیم الدین احمد، اُردو تنقید پر ایک نظر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۲، ص ۷۲

۳۔ ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، ص ۴۳۳

۴۔ ضیا الحسن، ڈاکٹر، حالی اور جدید اردو غزل، مشمولہ: بازیافت، حالی نمبر، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۱

۵۔ صالحہ عابد حسین، یادگارِ حالی، ارسلان بکس، آزاد کشمیر، س ن، ص ۷۹

۶۔ عبدالحق، مولوی، افکارِ حالی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۶۲

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اقبال شخصیت، افکار و تصورات: مطالعہ کا نیا تناظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۳

۸۔ عبدالحق، مولوی، افکارِ حالی، ص ۱۱۲

۹۔ حالی، الطاف حسین، کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، س ن، ص ۷۶

۱۰۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۹۱/ ۲۰۷

۱۱۔ حالی، الطاف حسین، کلیاتِ نظم حالی، جلد اوّل، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ص ۶۲

۱۲۔ حالی، الطاف حسین، کلیاتِ نظم حالی، جلد دوم، ص ۱۸۲

۱۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۶۰۵

۱۴۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اُردو، ص ۷۹ / ۹۵

۱۵۔ ناظر حسین زیدی، ڈاکٹر، حالی کی اصلاحی شاعری، مشمولہ: ماہِ نو، جلد نمبر ۲۳، شمارہ نمبر ۱، جنوری ۱۹۷۰ء، ادارہ مطبوعاتِ پاکستان، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۱

References in Roman Script:

1. Sajid Amjad, Dr., Urdu Shairi Per Bar-e-Sagher Kay Tehzeebi Asrat, Al-Waqar Publications, Lahore, 2003, p.432
2. Kaleem Uddin Ahmad, Urdu Tanqeed Per Aik Nazar, Porab Academy, Islamabad, 2012, p.72
3. Sajid Amjad, Dr., Urdu Shairi Per Bar-e-Sagher Kay Tehzeebi Asrat, p.433

4. Zia ul Hasan, Dr., Hali Aur Jadeed Urdu Ghazal, Mashmoola: Bazyaft, Hali Number, Oriental College Punjab University, 2016, p.171
5. Salah Abid Hussain, Yadgar-e-Hali, Arslan Books, Azad Kashmir, p.797
6. Abdul Haq, Molvi, Ufkar-e-Hali, Anjuman Taraqi Urdu, Karachi, 1976, p.62
7. Saleem Akhtar, Dr., Iqbal Shakhsiyat, Ufkar-o-Tasawurat: Mutaliya ka Naya Tanazur, Sang-e-Meel Publications, Lahore, 2013, p.143
8. Abdul Haq, Molvi, Ufkar-e-Hali, p.112
9. Hali, Altaf Hussain, Kulyat-e-Nazm Hali, 2nd Edition, Murataba: Dr. Iftikhar Ahmad Saddique, Majalis Taraqi Adab, Lahore, p.76
10. Iqbal, Kulyat-e-Iqbal, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1990, p.191/207
11. Hali, Altaf Hussain, Kulyat-e-Nazm Hali, 1st Edition, Murataba: Dr. Iftikhar Ahmad Saddique, p.62
12. Hali, Altaf Hussain, Kulyat-e-Nazm Hali, 2nd Edition, Murataba: Dr. Iftikhar Ahmad Saddique, p.62
13. Shams ur Rehman Farooqi, Shair Shoor Angez, 3rd Edition, Qaumi Council Baray Faroogh Urdu Zuban, New Dehli, 1997, p.605
14. Iqbal, Kulyat-e-Iqbal Urdu, p.79/95
15. Nazir Hussain Zaidi, Dr., Hali Ki Islahi Shairi, Mashmoola: Mah-e-Noo, Jild No:23, Shumara No: 1, January 1970, Idarah Matboat-e-Pakistan, Karachi, 1970, p.11

Dr. Sayeda Tayyaba Rubab is an Assistant Professor at Government Graduate College for Women, Karkhana Bazar, Faisalabad, Pakistan. She earned her PhD from GC University, Faisalabad, with a specialization in Urdu poetry and Iqbaiat. Dr. Rubab has authored two books and published nineteen research articles.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 18th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.412

انیس اشفاق کے ناول "ھیچ" میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و سماجی صورتحال

The Socio-Political Condition of Indian Muslims in Anees Ashfaq's Novel "Heech"

DR. SARA MAJEED[1] AND ZUNAIRA SIDDIQUE[2]

[1] Lecturer, Department of Urdu, The Women University, Multan, Pakistan.
[2] Visiting Lecturer, Department of Urdu, The Women University, Multan, Pakistan.
Corresponding author: Sara Majeed (saramajeed46@gmail.com)

ABSTRACT Anees Ashfaq's novel "Heech" reflects the shifting political and social conditions of Indian Muslims. It effectively portrays the identity crisis, fear and communal prejudice faced by minorities particularly Muslims. The novel highlights the ongoing religious discrimination, anti-Muslim sentiments and the rise of extremist political ideologies in contemporary India. The characters in "Heech" are caught in a struggle for survival and the preservation of their identity. Anees Ashfaq explores the complexities of human psychology, belief systems and political motives through a unique and symbolic narrative style. "Heech" is not merely a portrayal of Muslim victimhood but a profound social critique that exposes the contradictions within the current Indian system. Interestingly, the Hindu characters in the novel also express discontent with the prevailing circumstances, emphasizing that communal bias affects the entire society not just the minorities. Anees Ashfaq's narrative technique and literary voice hold a distinctive place in Urdu literature. This study attempts to explore how the identity and security of the Muslim individual are represented in literary texts against the backdrop of contemporary Indian political discourse.

Keywords Communalism, Political, Discrimination, Minorities, Extremism.

عصرِ حاضر میں لکھا جانے والا ناول اپنے موضوعات کے تنوع کے سبب ایک الگ پہچان رکھتا ہے۔ آج کا ناول نگار یہ کوشش کرتا ہے وہ ناول میں عام طبقے کے مسائل اور ان کے حل کی بات کرے۔ اس لیے ناول نگار کو معاشرے میں چھپی ہوئی تمام خوبیوں اور خامیوں کا مکمل ادراک ہوتا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں وہاں کا معاشرہ کبھی بھی ایک یا دو سال میں تشکیل نہیں پاتا۔ معاشرہ بننے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔ کئی صدیوں کے بعد کہیں جا کر ایک سماج کی شکل و صورت ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب ایک سماج اپنا وجود اس زمیں پر قائم کر لیتا ہے تب اس سماج میں بہت سے طبقے بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ جن سے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔

تمام ہندوستان کو مختلف مذاہب عالم کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ اس خطے میں بسنے والے مختلف مذاہب اور فرقے کے لوگ ہندوستان کی سماجی اور ثقافتی بنیاد کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ مذاہب اس گنگا جمنی تہذیب کے وارث ہیں۔ اِس خطے کی اکثریت آبادی ہندو مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی دیگر مذاہب اقلیت تصور کیے جاتے ہیں۔ ان اقلیتی فرقوں میں مسلمان، عیسائی، سکھ، بدھشٹ اور دیگر مذاہب شامل

***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

ہیں۔ ۲۰۱۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوؤں کی تعداد ۱۰۳ کروڑ اور مسلمانوں کی سترہ کروڑ تھی۔[۱]

ہندوستانی خطے میں رہنے والے مسلمانوں کے وجود کا اقرار بھی کیا جاتا ہے اور اس سے انکار بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ لیکن حالیہ چند برسوں میں مسلمانوں کو ایک مخصوص ہندو فرقے کی جانب سے معتصم، کبھی پناہ گزین تو کبھی قبضہ گروہ کے نام سے یاد کیا جارہا ہے۔ کبھی ان پر مذہب کو لے کر پابندی عائد کی گئی تو کبھی اِن کے عقائد اور مسلک کی تضحیک کی گئی۔ ہندوؤں کے دل میں مسلم بغض و عناد کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ہندوستان کے باسی جو کہ ہندو کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ذات پات، اونچ نیچ جیسے عقائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دوسرے فرقوں کو اپنے سے کم تر درجہ دیتے ہیں۔ مسٹر آر. جی. کے. نے اپنے ایک مضمون لکھا ہے۔

> "Caste Hindus, because their of obsesson with purity, could not in any case have much social inter course with either of them(christian and Muslim). Indeed, many of them tended to regard Muslims and Europeans, as mlechchss."[۲]

آج کے ہندوستان میں رہنے والا مسلم اپنی سماجی، ثقافتی، تہذیبی اور اقتصادی نظام کے تبدل کو دیکھ اور محسوس کر رہا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں کے پیچھے چھپے محرکات بھی اُس سے پوشیدہ نہیں۔ فرقہ وارانہ کشیدگی اور مذہب کو بنیاد بنا کر جو قتل و غارتگری کا ایک سماں آج کے ہندوستان میں پیدا کر دیا گیا ہے اس سے نا صرف مسلمان متاثر ہیں بلکہ باقی تمام اقلیتوں کو بھی برابر خطرہ لاحق ہے۔

اس تبدل و تغیر کو ہندوستان میں رہنے والے ہر باسی نے محسوس کیا۔ عام فرد کی سوچ اور فکر میں جہاں تبدیلی پیدا ہوئی، وہیں پر ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اگر ادب کی بات کریں تو یہ صرف لفظوں کا پیرہن یا گورکھ دھندا نہیں ہے جس میں ایک ادیب مختلف چیزوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ بلکہ ادب زندگی، سماج اور اس سے متعلقہ تمام چیزوں کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک اچھا ادیب سماج و معاشرے کا نبض شناس مانا جاتا ہے۔ وہ زندگی کی حقیقت اور سماجی مسائل کو الفاظ میں ڈھالتا ہے۔ وہ انسان کی زندگی کے نشیب و فراز کو بڑی خوبصورتی سے اپنے فن پاروں کا حصہ بناتا ہے۔

> "ادب اور سماج کے رشتے کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ سماج کیا ہے؟ اور ادب کیا ہے؟ سماج اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان۔ بغیر انسان کے سماج کا تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ سماج دراصل ان رشتوں کا نام ہے جو افراد کو ایک دوسرے سے منسلک رکھتے ہیں۔ ایک ادیب بھی سماجی اور معاشی اتار چڑھاو میں گھومتا رہتا ہے، اس طرح ایک ادیب بھی ان تمام باتوں سے اثرات قبول کرتا ہے۔"[۳]

اِس نازک موضوع پر بیشتر ادیبوں نے اپنا قلم اٹھایا۔ ہندوستان کی بدلتی سماجی صورتحال کو مختلف ناول نگاروں نے اپنے فن کا حصہ بنایا۔ ان میں سب سے بڑا نام مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ جنھوں نے اپنے ناول "مرگ انبوہ" میں اس موضوع پر لکھا۔ اس ناول میں ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی و سیاسی صورتحال کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ شفیق احمد خان شفق (کابوس، بادل)، یعقوب یاور (سنگ گراں ہے زندگی)، محمد علیم (جو اماں ملی تو کہاں ملی، گمشدہ آواز)، ترنم ریاض (مورتی، برف آشنا پرندے) جیسے ناول نگاروں نے بھی اس نازک اور اہم موضوع پر ناول تحریر کیے۔

عصر حاضر کا ایک اہم نام انیس اشفاق کا بھی ہے۔ ان کے اب تک چار ناول (دکھیارے، خواب سراب، پری ناز اور پرندے، ھیچ) منظر عام پر آچکے ہیں۔ ناول ھیچ جو کہ مسلمانوں کی سیاسی و سماجی صورتحال کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ انیس اشفاق کے اس ناول میں گہری سیاسی و سماجی

شعور کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات اور ان سے منسلک پیچیدہ گتھیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

انیس اشفاق جو کہ لکھنو کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاص لکھنوی اسلوب کو اپناتے ہوئے زندگی کی بے معنویت اور سیاسی و سماجی صورتحال، سماجی تقسیم، فرقہ وارانہ کشیدگی کو بڑی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ہندوستانی سماج کا حصہ ہوتے ہوئے، اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے۔ اسے ہمہ وقت احساس رہتا ہے کہ وہ جس معاشرے کا حصہ ہے اس میں موجود ایک مخصوص طبقہ اس کو ناپسند کرتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ آنے والا وقت اس مخصوص طبقے کا ہی ہے۔ اس ناول کا ایک کردار ایلیا آنٹی جب ہمسائے ملک کی طرف جانے لگتے ہیں تب ان کے شوہر علن میاں بتاتے ہیں۔

> "سچ پوچھو تو میں نہیں جانا چاہتا تھا لیکن ایلیا۔۔۔ تمہیں شاید نہ معلوم ہو نجوم میں بھی دخل رکھتی ہیں۔ اسی علم سے آنے والے زمانے کا حال جان لیتی ہیں۔ ادھر کچھ دن سے اٹھتے بیٹھتے کہے جا رہی تھیں: علن! یہاں کی زمین پر زمانہ بہت برا آنے والا ہے۔ پچاس ساٹھ برس بعد ہم لوگوں کا جینا مشکل ہو جائے گا۔"(۴)

اِس ناول کا ہر کردار اپنے وجود کی پہچان میں رہتا ہے۔ ہر کوئی اسی کش مکش کا شکار ہوتا ہے کہ کیا اس کا وجود اس دھرتی پر قابل قبول ہے بھی یا نہیں؟ اسی سوال کے جواب کی جستجو میں ناول کے دو مرکزی کردار شہنام اور شیلا بھی رہتے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کو اپنے وجود کے بقاء کی جنگ آخر تک لڑنی پڑتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ناکام رہتے ہیں۔ کیوں کہ ایک مخصوص طبقہ سیاسی حوالے سے اتنا طاقت ور ہو چکا تھا کہ وہ مسلم فرقے کو اس ملک کا حصہ ماننے سے انکاری تھا۔

مرکزی کردار کا ماننا ہے کہ یہ ملک ایک صلح پسند، تہذیب و ثقافت کی روایت کا علمبردار ہے۔ جہاں پر پہلے کبھی اس طرح کے واقعات نہیں ہوئے جو حالیہ چند برسوں میں ہو چکے ہیں۔ اور ان سب کے پیچھے وہ مخصوص طبقہ ہے جو اپنی اجارہ داری مذہب کی آڑ میں حاصل کرنے کی تگ و دو میں ہے۔ جب شہلا کو یونی ورسٹی سے گرفتار کر کے جیل میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تب وہاں پر اس نے ہندوؤں کے ایک مخصوص ٹولے کو بات کرتے سنا۔

> "ان کا کہنا تھا ہم اس زمین پر ہزاروں سال سے رہ رہے ہیں۔ جن لوگوں نے باہر سے آ کر ہم پر حکومت کی ہے، یہ زمین اب ہمیں ان سے آزاد کرانا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے تھے۔۔۔ انہیں اپنا ملک مل چکا ہے۔ یہ کیا کہ آدھے یہاں آدھے وہاں۔ سب ایک جگہ کیوں نہیں رہتے۔ ہماری زمین ان کے لیے نہیں ہے۔"(۵)

ہمیشہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مثبت سماجی رویے کسی بھی سماج میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر سماج میں منفی پہلو اثر انداز ہونا شروع ہو جائیں تو وہ معاشرہ یا سماج، تنزلی کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس ان منفی رجحانات کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح سماج اب فرقوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہیں۔ مسلم ہندو فسادات انہی رویوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہر ملک کا آئین و قانون اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس ملک کے تمام افراد چاہے وہ کسی مسلک یا مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ لیکن اگر ہندوستان کی بات کی جائے تو یہاں پر رہنے والے اقلیتی برادری خصوصاً مسلمان، ہمیشہ سے جرح کا حصہ رہے ہیں۔ ان کی ذات اور مذہب کو بنیاد بنا کر ان پر حملے کیے جاتے رہے ہیں۔ کبھی کسی مسلم کو گاؤ رکشا کے بہانے قتل کیا گیا تو کبھی نماز کی ادائیگی کو بنیاد بنا کر ان کو حراساں کیا گیا۔

انیس اشفاق نے اپنے ناول "ھیچ" میں ان تمام چیزوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کیوں کہ وہ بذاتِ خود اس سماج کا حصہ ہیں جہاں پر مسلم فرقے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ کبھی گائے کے گوشت کا معاملہ تو کبھی لاوڈا سپیکر پر دی جانے والی اذان سے متعلق کئی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ عقیدوں کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جا رہا تھا۔ انیس اشفاق سیاست اور عقیدے کو جوڑتے ہوئے شیلا کی زبانی اپنے ناول میں لکھتے ہیں۔

> "سیاست بندوں کی گنتی کا نام ہے۔ جتنا ہم دوسروں کے عقیدوں پر حملہ کرتے ہیں اتنا ہماری گنتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تو یہ سب بندوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف لانے کے لیے ہے۔
> میں نے جتنا پڑھا ہے اور جتنا پڑھ رہی ہوں اس میں یہی دیکھا گیا ہے کہ زیادہ تر جنگوں میں عقیدے ایک دوسرے سے ٹکرائے ہیں۔ ہاں اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خون بہائے جانے کا بڑا سبب مذہب ہی بنتا جا رہا ہے۔"(۶)

اس انتہا پسندی کی بو اب پورے ہندوستان میں ہر طرف پھیل چکی ہے۔ ہندو اپنے مذہب کو لے کر خاصے حساس ہو چکے ہیں۔ ان کا مہذب کو لے کر تنگ نظر ہونا، پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ وہ ہندوستان پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، چاہے وہ رستہ قتل و غارتگری کا ہی کیوں نہ ہو۔ عصر حاضر کی بات کی جائے تو سیاسی حوالے سے ہندوستان شدت پسند بن چکا ہے۔ موجودہ حکومت میں شدت پسند عناصر بہت نمایاں ہو کر آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مذہب کو بنیاد بنا کر مسلم ہندو فسادات کو ہوا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنے مذہبی مفادات کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ موجودہ حکومت بھارتی جنتا پارٹی کے نام نہاد رہنماؤں نے اپنے مفاد کی خاطر سماجی ڈھانچے کو کھوکھلا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

> "ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں ہمیشہ سے مسلم کام میں غیر مخلصانہ رویہ رکھتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان کو مختلف محازوں پر تنقید کا سامنا ہوتا ہے۔ اس ملک میں ایسی غیر سیاسی سیکولر سیاسی پارٹی ہے جو مسلمانوں کی وطن پرستی پر شک کرتی ہے۔"(۷)

مختلف سیاسی جماعتوں کے آشر باد سے مذہب اور قومیت کو بنیاد بنا کر ہمیشہ سے خانہ جنگی کی جاتی رہی ہے۔ فرقے اور مذہب کو بنیاد بنا کر خونی کھیل ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیاست دانوں کی پشت پناہی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انیس اشفاق نے اپنے ناول میں اس پر کھل کر بات کی ہے۔ وہ کسی سیاسی جماعت کا نام تو نہیں لیتے۔ لیکن ان کے اعمال سے قاری آسانی سے سمجھ جاتا ہے کہ یہ کس طرف اشارہ ہے۔ مختلف طبقہ اپنے لوگوں کی ذہن سازی کرتے ہوئے ان کے دل و دماغ میں مسلم مخالف باتیں پیدا کر کے ایک قسم کا بارود تیار کر رہے ہیں۔ جو کبھی بھی فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورت میں پھٹ سکتا ہے۔ "ھیچ" میں بھی اس طرح کے لوگ اپنے مقاصد کے لیے ایسے ہتھیار تیار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ مسلم طبقے میں خوف و ہراس پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے میں سیاسی رہنما پیش پیش رہتے ہیں۔

اس ناول کا ایک ہندو کردار مسز بنرجی کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے۔ جو کہ دہلی کی ایک یونی ورسٹی کی پروفیسر ہے۔ وہ ان بدلتی صورتحال کو دیکھ کر بڑی دکھی ہے۔ اس کردار کی زبانی انیس اشفاق لکھتے ہیں۔

> "نئے قوانین بن رہے ہیں اور آگے اور بنیں گے اور یہ سارے قانون ہماری بھلائی کے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کو اپنی طرف لانے کے لیے بنیں گے جو ملانے سے زیادہ بانٹنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اپنی تاریخ کو دوبارہ زندہ کرنے کے نام پر وہ بھی بدل دیا جائے گا جسے نہیں بدلنا چاہیے۔"(۸)

اِس اقتباس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کا مسلم ہی ان فسادات کا شکار نظر نہیں آتا بلکہ ہندو بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ انیس اشفاق اپنے خاص لکھنوی زبان و بیان اور منفرد اسلوب کے سبب اپنی ایک منفرد حیثیت اردو ادب میں رکھتے ہیں۔ انھوں نے اکیسویں صدی کے ہندوستانی سماج کی عکاسی اپنے ناول ھیچ میں کی ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے شاید اس پر لکھنا اور وہ بھی اس سماج کا حصہ ہوتے ہوئے خاصا مشکل کام ہے۔ انھوں نے اپنے اس ناول میں بعض مقامات پر استعاراتی اور علامتی زبان کا استعمال بھی کیا ہے۔ اس کے پیچھے ایک ہی وجہ ہے کہ اس سماج میں رہتے ہوئے جہاں پر مسلمانوں کو برا سمجھا جاتا ہے اس کے خلاف لکھنا معنی خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ناول میں سفاک سیاست اور ان کے گھناونے کھیل پر کھل کر بات کی ہے۔ ان کی تحریروں میں جہاں ہمیں مسلمانوں کی بے بسی اور مایوسی کی جھلک نظر آتی ہے وہیں پر کہیں کہیں امید کی لو بھی جلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت نے ایک نیا قانون پاس کیا۔ جس کے تحت ہندوستان میں رہنے والے تمام مسلمانوں کو اپنی شہریت کا ثبوت دینا ہو گا۔ اس قانون کے خلاف بہت سی بغاوتیں ہوئی، احتجاج کیے گئے لیکن سب بے سود۔ انیس اشفاق نے بھی اس کالے قانون کا ذکر اپنے ناول میں کرتے ہیں۔

"شہریت والی۔ اُس میں تو ہمارے پرکھے یہاں کب سے رہ رہے ہیں، یہ ثبوت دینا ہو گا۔ اور پرکھوں کے رہنے کا ثبوت دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔"

"اس کا مطلب جو ثبوت نہیں دے سکا، اسے زمین چھوڑنا پڑے گی۔"

"قانون تو اسی طرح کا بن رہا ہے۔"(۹)

ہندوستان کو آزاد ہوئے ستر دہائیاں ہو چکی۔ بیشتر مسلمان پاکستان ہجرت بھی کر گئے۔ لیکن آج بھی ہندوستان جیسی سیکولر اور جمہوریت پسند ریاست میں مقامی مسلمانوں سے ہندوستانی ہونے کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔ "ہندوستان کے سماجی حالات، سیاسی و معاشرتی صورت حال اور اس کے تناظر میں کی گئی سرگرمیاں، اور ان سرگرمیوں کے منفی اثرات نے نا صرف ہندوستانی فرد کی سالمیت اور اس کے تحفظ پر سوالیہ نشان پیدا کر دیا ہے وہیں پر معاشرتی زندگی کو بھی لہولہان کر دیا ہے۔"(۱۰) ہندوستانی سماج میں دو ہی بڑے مذاہب آباد ہیں۔ ان کے درمیان آئے روز مذہب کو بنیاد بنا کر فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ وہ فسادات پھر گجرات کی طرز پر ہو یا بابری مسجد کو بنیاد بنا کر کیے جائیں۔ ہر طرف سے نقصان اقلیت کا ہوا ہے۔ ہندو اپنے مفادات کی خاطر مسلمانوں کی مذہبی عبادت گاہوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ بابری مسجد کا واقعہ جب ہوا تو مسلمانوں کے ہاں غم و غصّے کی کیفیت عروج پر تھی۔ جس کے سبب فسادات کو ایک چنگاری مل گئی۔

انیس اشفاق جیسے ادیب بھی اس واقعے سے متاثر ہوئے۔ کیوں کہ ان کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا جو کہ ہندوستان میں اقلیت تصور کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اس واقعے کو اپنے ناول میں کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں۔

"عبادت گاہوں پر دعوؤں کی مہم تیز ہو رہی ہے۔ اور وہ عبادت گاہیں خاص نشانے پر ہیں جنہیں انگریزوں سے پہلے والی حکومتوں نے بنوایا تھا۔"

"اس کا مطلب ایک بڑا ہنگامہ ہونے والا ہے۔"

"ہاں۔ اور ان میں سے ایک عبادت گاہ کی طرف کوچ کی تیاری ہے۔"(۱۱)

مندرج بالا اقتباس میں انیس اشفاق نے مسلمانوں کی مسجدوں کو عبادت گاہوں سے تشبیہ دی۔ اس اقتباس میں جس عبادت گاہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ اشارہ بابری مسجد کی طرف ہے۔ کیوں کہ اس عہد میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان جو سب سے بڑی وجہ لڑائی کی تھی وہ عبادت

گاہیں تھیں۔ ہر مذہب اِن پر اپنی ملکیت کا دعویٰ دائر کر رہا تھا۔ اس طرح کے واقعات نے ہندوستانی مسلمانوں میں خوف کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔ ہر مسلمان سیاسی و سماجی حوالے سے ایک ان دیکھے خوف کا شکار ہو رہا تھا۔ اس کو نہیں معلوم کہ کب کوئی ہندو مذہب اور فرقے کو بنیاد بنا کر اس پر حملہ آور ہو جائے۔ اس خوف کی فضاء میں سانس لینا دشوار ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی سماجی صورت حال دن بہ دن کشیدہ ہو رہی تھی۔ ان حالات میں مسلمانوں کا خوف کھانا عام بات تھی۔

مسلمانوں کی املاک اور جان کو خطرہ پیدا ہو چکا تھا۔ بابری مسجد کے واقعے کو لے کر مسلمان تکلیف اور اذیت میں مبتلا تھے۔ پورے ہندوستان میں ایک خاص طبقے کی طرف سے بے چینی و بے سکونی کا ماحول پیدا کر دیا گیا تھا۔ یہ مخصوص طبقہ جو اپنی اجارہ داری قائم کرنا چاہتا ہے وہ نا صرف اس کو پھیلا رہے تھے بلکہ اس کو اپنی آنے والی نسل میں بھی منتقل کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ سے اپنی ذات اور فرقے کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی اور مسلمانوں کے ظلم و جبر کی کہانیوں کو من گھڑت بنا کر آنے والی نسل میں منتقل کر رہے تھے۔ یہ مخصوص طبقہ جو کہ شہلا کے جیل جانے کے بعد منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ جیل سے باہر آتے ہی مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت کا حصہ بن چکے تھے۔ یہ صرف حکومت کا ہی حصہ نہیں تھے بلکہ قانون نافذ کرنے والے محکمہ جات سے بھی وابستہ ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایسے قوانین بنائے جو کہ مسلم دشمنی کے سواء کچھ نہ تھا۔

اس ناول کے دونوں مرکزی کردار شہنام اور شہلا اسی سماج کا حصہ تھے جس میں تفرقہ کی آگ لگ چکی تھی۔ یہ دونوں کردار ہر معاملے کو بڑی گہرائی سے دیکھ رہے تھے۔ جب بابری مسجد کا واقعہ ہوا تو شہلا کے خط میں لکھی گئی باتیں فلسفیانہ ہی سہی لیکن حقیقت نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ انیس اشفاق لکھتے ہیں۔

> "عمارت کے ڈھائے جانے والے دن جو تم پر گزری ہو گی میں سمجھ سکتی ہوں۔ تم ہی کیا ہر وہ شخص جو دوسرے مذہبوں کے لیے اپنا دل کشادہ رکھتا ہے اور جو پرانے آثار کی اہمیت کو جانتا ہے، اس کا دل اس بڑے سانحے پر ضرور بیٹھ گیا ہو گا۔ مینار ہو یا کلس، کھنڈر ہو یا صلیب یہ محض مذہبی نشانیاں نہیں، یہ ہماری تاریخ اور تہذیب دونوں کے آئینے ہیں۔"(۱۲)

اس اقتباس میں مذہبی عمارات کو محض ایک عبادت گاہ کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ اس کو تاریخ کی آئینے میں دیکھا گیا ہے۔ جس پر ہر طبقے کا فرد چاہے وہ ہندو ہو یا عیسائی یا مسلم، تمام ہی دکھی تھے۔

انیس اشفاق کا یہ ناول ہندوستان کی سیاسی و سماجی صورتحال کے پس منظر میں لکھا گیا کامیاب اور منفرد ناول ہے۔ انھوں نے اپنے خاص اسلوب اور زبان کے ذریعے اس میں جان ڈال دی ہے۔ اس ناول میں ناول نگار نے سماج کے مختلف رویوں اور انسانی فرد کی کیفیات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ جہاں سماج میں مسلم طبقے کو پریشانی کا سامنا ہے وہیں پر اس طبقے کے دوسرے مذاہب بھی اس تبدیلی سے ناراض ہیں۔ سیاسی جماعتیں خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتی ہوں اپنی ناکامیوں کو چھپانے کیے لیے مسلم دشمنی اور ہندو مسلم فسادات کا سہارا لیتے ہیں تاکہ اپنی عوام کے دل و دماغ میں مسلم دشمنی کو ختم نہ ہونے دیا جائے۔ ہندوستان میں جہاں بھی مسلمان رہتا ہے اس کو دہشت گرد کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا وہ مقام اور رتبہ جو کہ ایک اچھے سماج میں ہونا چاہیے وہ اس کو نہیں مل پاتا۔

ہندوستان سیاسی حوالوں سے ہی مسلمان کو کمزور نہیں کر رہے بلکہ وہاں کی قانون نافذ کرنے والے ادارے بھی اس کام میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ پولیس والوں کا جانبدار ہونا مسلم دشمنی کا ثبوت ہے۔ پولیس تو شاذ و نادر ہی اس طبقے کی بھلائی کرتی ہے۔ لیکن اس محکمہ نے مسلم دشمنی

میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انیس اشفاق نے ان تمام رویوں کو اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ ناول نگار اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں ہندوستانی سماج کی عکاسی اپنے ناول میں کی ہے۔ اس معاشرے کے مخصوص طبقے کی ذہنیت اور شیطانی عمل کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ناول اپنے عہد کا ایک ترجمان ناول ہے جس نے حقیقت نگاری کے ذریعے سماج میں چھپی ہوئی چیزوں کو کھول کر بیان کیا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ رؤف الرحمن خان، ہندوستان کی اقلیتی آبادی مسائل اور امکانات، اسکول آف منیجمنٹ اسٹڈیز، ممبئی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱

۲۔ R.G.K, IIlustrated weekly, june 1980

۳۔ ایمن انصاری، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، نصرت پبلشرز، لکھنو، ۱۹۸۸ء، ص ۱۷

۴۔ انیس اشفاق، ھیچ، بک کارنر، جہلم، ۲۰۲۴ء، ص ۴۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۶۔ ایضاً، ص ۲۸۶

۷۔ رؤف الرحمن خان، پروفیسر، ہندوستان کی اقلیتی آبادی مسائل اور امکانات، ص ۶۴

۸۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۹۔ انیس اشفاق، ھیچ، ص ۳۳۲

۱۰۔ مہ پارہ اسلم، منتخب ہندوستانی ناولوں میں مسلمانوں کی معاصر سیاسی و سماجی صورت حال، تحقیقی مقالہ ایم۔فل، مملوکہ: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ۲۰۲۴ء، ص ۷۶

۱۱۔ انیس اشفاق، ھیچ، ص ۲۸۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۹۰۔۲۹۱

References in Roman Script:

1. Rauoof ul Rehman, Hindustan mein Aqliati abadi: Msail aur Imkanat, School of Majagment Study, Mumbai, 2013, p.11
2. R.G.K, Illustrated weekly, june 1980.
3. Eman Ansari, Urdu Novelon mein Smaji Msail ki Akasi, Nusrat Publishers, Lakhnau, 1988, p.17
4. Anees Ishfaq, Heech, Book corner, Jahlum, 2024, p.47
5. Ibid, p.197
6. Ibid, p.286
7. Rauoof ul Rehman, Hindustan mein Aqliati abadi: Msail aur Imkanat, p.64
8. Ibid, p.329
9. Anees Ishfaq, Heech, p.332

10. Mahpara Aslam, Muntkhib Novelon mein Muslmanon ki Muasr Syasi O Smaji Sorat-e-Hal, Tehqeeqi Mqala M.Phil Urdu, Islamia University of Bahawalpur, Bahawalpur, 2024, p.72
11. Anees Ishfaq, Heech, p.284
12. Ibid, p.290-291

Dr. Sara Majeed is a Lecturer in the Department of Urdu at Women University Multan, Pakistan. She earned her PhD from the same university, specializing in Urdu fiction and literary criticism. Dr. Sara has authored ten research articles and was awarded a gold medal for her outstanding performance in her MA studies.

Ms. Zunaira Siddique is currently pursuing her PhD in the Department of Urdu at The Women University, Multan, Pakistan. She has published three article and holds an MPhil degree in Urdu Literature from the same university.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 15th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.407

"سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں جادوئی حقیقت نگاری

Magical Realism in "Sangha san Batesi" and "Betaal Pachesi"

DR. MUHAMMAD RAMZAN
Lecturer, Department of Urdu, Center of Excellence, Government Higher Secondary School, Jaranwala, Pakistan.
(cssexcellentacademy@gmail.com)

ABSTRACT The term "Magical realism" translated as “Jadowi Haqiqat” in Urdu is a modern technique. Hawan Ralpho, for the first time, used it in his stories. The Latin novelist Gabriel Garcia, by using the technique of "Magical Realism" in his novel “Hundred Years of Solitude” in 1967, revolutionized the style of narration all over the world, and Urdu Literature is no exception especially in the first half of twentieth century characterized by the use of various descriptive techniques like letters, diaries, flash backs, flash forwards, surrealism and realism etc. Magical Realism is one of such powerful techniques.” Sangha San Batesi” and “Bettal Pachesi” stories are related to the imaginary and ideal world. Where different characters including giants, fairies, jinns, ghosts, ascetics, jogis and leaves keep the reader in a wonderful struggle from the beginning to the end. All the stories of “Singhasan Batesi” and “Bettal Pachesi” evoke an atmosphere of imagination and romance. In addition to the religious and cultural landscape, there is also a conflict between them. Raja Bakarmajit's character is Dev Malay and a character with transcendent abilities. Raja Bakarmajit's tenure has been described in the words of government puppets. In these stories, the magic and talismanic atmosphere surrounds the characters of good and bad everywhere in a believable manner. Apart from this, there are glimpses of Bikramjit's courage, generosity, courage, wisdom and wise decisions. In the stories of “Singhasan Batesi” and “Bettal Pachpesi”, the situation of the supernatural and the supernatural elements creates a surprise for the reader.

Keywords Talismanic, Magic, Glimpses, Imagination, Puppets, Supernatural.

انگریزی میں جادوئی حقیقت کے لیے لفظ میجکل رئیلزم کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ میجکل رئیلزم ایک جدید اصطلاح ہے جس کو سب سے پہلے حوان رلفو نے اپنے ناولوں میں استعمال کیا۔ تاہم میجکل رئیلزم کی تکنیک کو فکشن میں فرانز کافکا نے بھی استعمال کیا۔ ان کے ناول 1925 "The Trial" اور 1926 "The Castle" نے فکشن کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ یہ دونوں ناول اپنے عہد کے عظیم ثابت ہوئے۔ کافکا نے جدید انسان کی اجنبیت کو کسی علت و معلول کے رشتے کے بغیر پیش کیا۔ اس کے ناولوں کی غیر حقیقی فضا میں حقیقت کی ماورائی شکلیں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کافکا کے آرٹ کو آخری حقیقت تک انسانی رسائی کا سب سے بڑا پراسرار اور گہرا اظہار کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد گبرئیل گارشیا مارکیز نے اپنے ناولوں میں بھی جادوئی حقیقت نگاری کی تکنیک کو بیان کیا ہے۔

***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

ان کا پہلا ناول "تنہائی کے سو سال" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا جو کہ میجکل رئیلزم کا شاہکار ہے اور اس بیانیے کو اپنانے والے مغربی ادیبوں میں کیوبا کے الیخو کارپین ٹیئر، گوانتامالا کے اینجل استوریاس، چلی کی خاتون ازابیل الینڈے، لارا ایسکیول، اینجلا کارٹر، حوزے ساراماگو، حوان رلفو، گارشیا مارکیز، حولیو کارتازار، کارلوس فونتیس، ماریو برگس یوسا اور لوئس بورخیس کے نام نمایاں ہیں۔ اردو داستانوں میں "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں پائے جانے والے کردار طلسماتی، ماورائی اور جادوئی حقیقت نگاری پر مشتمل ہیں۔ جادو کے معنی سحر، افسوں، منتر اور ٹونا کے ہیں جب کہ حقیقت نگاری کا مطلب سچائی اور صداقت کے ہیں۔ اردو ادب میں جادوئی حقیقت نگاری سے مراد زندگی کے وہ اسرار و رموز جو کہانی میں مختلف کرداروں کے ذریعے مافوق الفطرت انداز میں بیان کیے جاتے ہیں۔ جادوئی حقیقت نگاری تخیلاتی رنگ آمیزی کے ذریعے فکشن میں واقعات کو حقیقت کے دھارے میں پیش کرتی ہے۔ فطرت انسانی ہمیشہ سے حیرت انگیز واقعات میں دلچسپی لینے، ناقابل یقین اور معجزاتی چیزوں میں تسکین کی متلاشی رہی ہے۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کو منفرد اور جدید انداز میں تسہیل نگاری کی روایت کو مد نظر رکھتے ہوئے تسہیل، تفہیم اور تدوین کا کام جس عرق ریزی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے، نہایت قابل ستائش ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نجیب جمال لکھتے ہیں۔

> "ڈاکٹر بصیرہ عنبرین ہندی متن کو براہ راست پڑھ سکتی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، قدیم متون پر تحقیقی مقالات لکھ چکی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کلاسیکی متون پر ہونے والے تسہیل کے کام سے باخبر ہونے کے باعث ہر قدم پر موجود قرات و تفہیم کی مشکلات سے بخوبی واقف ہیں۔۔۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین متنی انحرافات سے حتی الامکان گریز کرتے ہوئے کہانیوں کی دیومالائی اور مافوق الفطرت فضا کو بحال رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نئے املائی ضابطوں کو بروئے کار لانے، اصطلاحات اور بنیادی تہذیبی لفظیات کو برقرار رکھنے میں خصوصی درک سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اردو کے داستانوی ادب کے سوتوں کو خشک ہونے سے بچایا ہے اور یہ کام انھوں نے تسہیل کے جدید اصولوں کے مطابق کیا ہے۔"(۱)

"سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" داستانوں کا تعلق خیالی اور مثالی دنیا سے ہے۔ جہاں دیو، پریاں، جن، بھوت، سنیاسیوں، جوگیوں اور پتلیوں پر مشتمل مختلف کردار قاری کو آغاز سے انجام تک حیرت انگیز کشمکش میں مبتلا رکھتے ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کی تمام کہانیاں تخیل اور رومان کی فضا کو جنم دیتی ہیں۔ ان میں مذہبی اور ثقافتی منظر نامہ کے علاوہ رزم و بزم کی کشمکش بھی پائی جاتی ہے۔ راجہ بکرماجیت کا کردار دیومالائی اور ماورائی صلاحیتوں کا حامل کردار ہے۔ راجہ بکرماجیت کا عہد حکومت پتلیوں کی زبانی بیان کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں میں جادوئی اور طلسماتی فضا ہر جگہ خیر و شر کے کرداروں کو محیر العقول انداز میں سمیٹے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں بکرماجیت کی شجاعت، سخاوت، ہمت و دانائی اور حکیمانہ فیصلوں کی پر شکوہ جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" کی کہانیوں میں فوق العادہ اور مافوق الفطرت عناصر کی صورت حال قاری کے لیے حیرت کا باعث بنتی ہے۔ "سنگھاسن بتیسی" کی پتلیاں جن

میں رتن منجری، چتر ریکھا، رتی باما، چندر کلا، کیلا وتی یا لیلا وتی، کام کندلا، کامودی، پوہ پاؤلی، بدھ ماوتی، پریما وتی، پرماوتی، کیرت وتی، ترلوچی، بلوچی، انوپ وتی، سندر وتی، ستیہ وتی، روپ ریکھا، تارا، چندر جوتی، انرودھ وتی، انوپ ریکھا، کرناوتی، چتر کلا، جے لکشمی، بدیا وتی، جگجوتی، من موہنی، بیدیہی، روپ وتی، کوشلیا اور بھان متی عہد بکرماجیت کا جیتا جاگتا کردار ہیں۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین "سنگھاسن بتیسی" کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> "سنگھاسن بتیسی کا شمار بھی قصہ کہانیوں کی اسی خیالی اور مثالی دنیا سے ہے۔ جو فورٹ ولیم کالج کے تحت اس وقت کی قابل فہم زبان میں ڈھل کر نئی معنویت سے ہم کنار ہوئی۔ یہاں قصہ در قصہ واقعاتی سلسلے ملتے ہیں۔ بہ ظاہر یہ قصے راجا بکرماجیت کے ماضی سے متعلق ہیں۔ لیکن راجا کو پیش آنے والے تمام تر واقعات و حوادث، تحیر و تحسر اور تخیل و رومان کی ایک ایسی دنیا پیش کرتے ہیں جس میں بڑا تنوع ہے۔ کہیں مذہبی و قومی فضائیں ہیں تو کہیں تہذیبی و ثقافتی رنگ، کہیں رزم و بزم کا منظر نامہ ہے تو کہیں عشق و محبت کی لطافتیں اور سب سے بڑھ کر یہاں حیات انسانی کے اتار چڑھاؤ کو مد نظر رکھتے ہوئے انسان کے تمام تر طمطراق اور شکوہ کے سامنے اس کی بے مائیگی، بے ثباتی اور حرمان نصیبی کا کا احساس نمایاں کرنا ان قصوں کو آفاقیت اور ندرت عطا کر گیا ہے۔ ایسے مواقع پر یہ کہانیاں محض بکرماجیت کے عہد کی اسیر نہیں رہتی بل کہ طلسم زماں و مکاں توڑ کر آگے بڑھ جاتی ہیں اور چشم زدن میں ہمارے زمانے سے آملتی ہیں۔"(۲)

"بیتال پچیسی" سنسکرت الاصل داستان ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے دوران مظہر علی خاں ولا نے للو لال کوی کے تعاون سے برج بھاشا میں اس داستان کو تحریر کیا۔ "بیتال پچیسی" کے اصل متن میں کئی پیچیدگیاں اور دشواریاں قاری کو پیش آتی ہیں۔ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین نے جس عرق ریزی سے سنگھاسن بتیسی اور "بیتال پچیسی" کو تفہیم، تسہیل اور تحشیہ کے ذریعے جدید انداز میں مرتب کیا۔ داستانوی اردو ادب ان کا ہمیشہ مرہون منت رہے گا۔ "سنگھاسن بتیسی" کی اشاعت کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

> "کاظم علی جوان نے اولاً ۱۸۰۰ء میں ان کہانیوں کو اردو میں بعد ازاں ۱۸۰۵ء میں پہلے دیوناگری اور پھر اردو رسم الخط میں "سنگھاسن بتیسی" کے نام سے شائع کرایا۔ یہ کتاب ہندوستان کے مختلف اشاعتی اداروں سے چھپتی رہی اور اس کی دوسری ہندوستانی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔ "سنگھاسن بتیسی" کی اہم اشاعت مطبع نولکشور، لکھنو سے سامنے آئی اور بعد ازاں اس ادارے سے کئی اڈیشن شائع ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی "تاریخ ادب اردو" میں یہیں کے شائع کردہ متن کو اپنایا ہے اور ان کے پیش نظر اس کی تیرھویں اشاعت (۱۹۵۳ء) رہی۔ پاکستان سے "سنگھاسن بتیسی" اردو فکشن کے ممتاز مصنف، دانش ور اور نقاد انتظار حسین کی کوشش سے سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے ۲۰۱۴ء میں چھپی اور ان کے سامنے بھی بنیادی طور

پر منشی نول کشور کا شائع شدہ متن رہا۔ "سنگھاسن بتیسی" کی منظوم صورتیں بھی موجود ہیں۔ جن میں نمایاں صورت بارہویں صدی ہجری کے غیر معروف شاعر فقیر دکنی کا منظوم ترجمہ ہے۔ جسے انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی سے افسر صدیقی نے ۱۹۸۴ء میں مرتب کر کے شائع کرایا۔ یہ ۹۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح منشی لال چمن کا منظوم ترجمہ بھی اہم ہے۔ جو ۱۲۹ صفحات پر مبنی ہے اور ۱۸۷۱ء میں منشی نول کشور پریس کان پور سے چھپا۔" (۳)

"بیتال پچیسی" پیشاچی پراکرت میں برھت کتھا گناڈھیہ کی کتاب بہت مشہور ہے۔ موجودہ تحقیق کے مطابق اس کا عہد ۷۸ء بتایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سنسکرت زبان کے تراجم میں برھت کتھا منجری اور کتھا سرت ساگر کے نام سے مشہور ہے۔ "بیتال پچیسی" کی کہانیوں کا مرکزی کردار بکرم ہے جو اپنے بھائی وکرم کو قتل کر کے حکمرانی کا تاج اپنے سر سجاتا ہے۔ بیتال بھوتوں کی اس قسم کو کہتے ہیں۔ جو انسانی مردوں کی لاشوں میں بستے ہیں۔ اس داستان میں بکرماجیت کی ملاقات بیتال سے اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ ایک درخت سے لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ داستان "بیتال پچیسی" کی کہانیوں میں طلسماتی اور ہندو دیومالا کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین "بیتال پچیسی" کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "بیتال پچیسی کی کہانیوں میں فوق الفطری عناصر کم ہیں۔ دیومالا کے اثر سے کچھ خلاف عادت باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن وہ اردو داستانوں کے فوق الفطرت سے مختلف ہیں مثلاً بکرم ایک چور کے تعاقب میں ایک کنویں کی راہ سے پاتال میں پہنچ جاتا ہے۔ یہ داستان امیر حمزہ کے چاہ الماس سے جدا ہے۔ کئی جگہ مندر کی دیوی کا مجسمہ کسی بات پر خوش ہو کر بول اٹھتا ہے۔ مرے ہوؤں کو امرت چھڑک کر جلا دیا جاتا ہے۔" (۴)

داستان "سنگھاسن بتیسی" عجیب و غریب واقعات اور طلسماتی فضا سے بھرپور نظر آتی ہے۔ اس کا آغاز ایک کسان سے ہوتا ہے۔ جو مچان پر چڑھتے ہی پکارتا ہے کہ راجا بھوج کو گرفتار کر کے میرے سامنے پیش کرو۔ لیکن جونہی مچان سے اترتا ہے تو اس کی عقل و ہوش ٹھکانے آجاتی ہے۔ راجا بھوج کو جب اس واقعہ کی خبر ہوتی ہے تو وہ نجومیوں کو بلا کر اس راز کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ انھوں نے راجا کو بتایا کہ اس جگہ زمین میں خزانہ دفن ہے۔ راجا یہ سن کر فوراً زمین کھدائی کا حکم دیتا ہے تو زمین کے نیچے اچانک سنگھاسن (تخت شاہی) برآمد ہوتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند سنگھاسن بتیسی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

> "سنگھاسن میں پتلیاں جو قصے سناتی ہیں وہ فنی اعتبار سے مکمل افسانے نہیں۔ ان سب کا مقصد بکرم کی سخاوت یا شجاعت یا کسی اور وصف کا راگ گانا ہے۔ چنانچہ بعض کہانیاں جو زیادہ مختصر ہیں۔ محض واقعہ نگاری ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کہانیوں میں دیومالا کا گہرا اثر ہے۔ بیتال پچیسی سے زیادہ پاتال، اندر لوک، اندر دیو، سمندر دیوتا، چاند دیوتا، شیو، شیش ناگ، جم کے دوت، دیوی اور گندھرو یہ سب بار بار رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کنگالن اور دیت بیتال کا کردار بھی جادوئی

حقیقت نگاری پر مشتمل ہے۔ دیوتاؤں، جوگیوں اور بیتالوں سے جابجا کر اماتی تحائف ملتے ہیں مثلاً ایک ایسی تھیلی کہ اس میں سے کھانے کی جو چیز چاہو نکال لو، ایسی چھڑی جس کے پاس ہو وہ سب کو دیکھ سکے اور اس کو کوئی نہ دیکھ سکے، ایسا لعل جس میں جتنی دولت چاہو مل جائے۔ بکرام کو ایسے متعدد تحفے ملتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ فراخ دلی سے کسی نہ کسی حاجت مند کو دان دیتا ہے۔"(۵)

"سنگھاسن بتیسی" (تخت شاہی) جب زمین سے نہیں نکلتا تو اس کے لیے کروڑ بھینسے اور بکرے قربان کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ خود بخود زمین سے باہر آجاتا ہے۔ راجا سیام سومیر کے بیٹے کا کردار بھی طلسماتی اور کرشماتی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایسا عالم فاضل ہے کہ لوگوں کو موت کے بارے میں آنے والے واقعات کی پیش گوئی بھی کرتا ہے۔ راجا بکرم کے پاس ایسی طاقت ہے کہ پچھی بھی ہاتھ باندھ کر حاضر ہو کر عرض کرتی ہے کہ اگر آپ کا حکم ہو تو میں خزانہ برسا کر تمہاری رعایا کو خوشحال کر دوں۔ راجا نے یہ سن کر کہا! اگر تمہاری مرضی ہو تو میرا بستر چھوڑ کر جہاں تمہارا دل چاہے برس پڑو۔ اس حوالے سے چندر کلا چوتھی کہانی کا اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"رات کا چوتھا پہر ہوا، تو پچھی دوبارہ آئی اور کہنے لگی، راجا مجھے بتاؤ، میں کہاں برسوں؟ راجا نے کہا کہ اگر تو کہیں برسنا چاہتی ہے تو بستر چھوڑ کر جہاں تیری مرضی ہو، وہاں برس۔ اتنا کہتے ہی پورے شہر پر خوب سونے کی بارش برسی۔ صبح ہوئی تو راجا اٹھا اور دیکھ کر کہنے لگا کہ ہماری رعایا پر بہت سختی تھی۔ لیکن اب کچھ دن بے فکر ہو کر آرام و سکون سے رہے گی۔ اتنے میں وزیر آیا اور اطلاع دی کہ مہاراج! تمام شہر میں سونا برسا ہے، جو آپ حکم دیں، وہی ہم کریں؟ تب راجا نے کہا کہ شہر میں ڈھول بجوا دو اور جس کسی کی حد میں جو دولت آئے، سو وہ لے اور کسی کو منع نہ کرے، راجا کا یہ حکم سن کر سب رعایا نے اپنے گھر میں دولت بھر لی۔"(۶)

مذکورہ بالا تحریر میں پچھی کا راجا کے حکم پر پورے شہر کے اوپر سونے کی بارش کرنا اور رعایا کی تنگدستی کا اچانک خوشحالی میں بدلنا قاری کے لیے حیرت کا سبب بنتا ہے۔ سائنس فکشن ایسے عناصر کی تردید کرتا ہے۔ لیکن طلسماتی حقیقت نگاری کے لیے ایسے عناصر معاون ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم ایسے واقعات جادوئی اور طلسماتی حقیقت نگاری کے ذریعے مافوق الفطرت عناصر کا باعث بنتے ہیں۔ "سنگھاسن بتیسی" کی چھٹی کہانی کام کندلا میں ایک برہمن، راجا کو عجیب و غریب واقعہ بیان کرتا ہے۔ انھوں نے راجا کو بتایا کہ شمال کی طرف ایک جنگل میں پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ کے سامنے ایک پانی کا تالاب ہے۔ جس میں بلور کا ایک ستون جو طلوع سورج بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں سورج مشرق سے ابھرتا ہے تو بلور نما کھمبا بھی بلند ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ عین دوپہر کے وقت ستون سورج کے رتھ کے قریب جا کر آسمان کے پہنچ جاتا ہے۔ رتھ ٹھہر جاتا ہے اور سورج کھانا کھا کر جب مغرب کی طرف بڑھتا ہے تو بلور نما کھمبا بھی گھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ غروب آفتاب کے وقت ستون بھی تالاب میں گھٹتے گھٹتے گم ہو جاتا ہے یہ سلسلہ صدیوں سے یونہی رواں دواں ہے۔ کام کندلا قصہ میں ستون کا خود بخود بڑھنا، سورج کا رتھ پر سوار ہونا اور آفتاب کا کھانا تناول کرنا طلسماتی حقیقت نگاری کا موجب بنتا ہے۔ کامودی پتلی کی

ساتویں کہانی میں کنگالن کی بہن پورنا راجا کو ایک تھیلی دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کی یہ خوبی ہے جو کچھ بھی کھانے کو تمہارا دل چا ہے گا تھیلی کے اندر موجود پائے گا۔ راجا یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے اور تھیلی کو لے کر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح راستے میں ان کی ایک برہمن سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ راجا سے بھوک کی شکایت کرتا ہے۔ راجا نے ان سے پوچھا کیا کھاؤ گے؟ انھوں نے کہا! پکوان کھاؤں گا۔ راجا نے تھیلی سے کھانا نکالا تو پکوان ہی تھا اقتباس دیکھیے۔

> "وہاں ایک محل تھا، کنگالن نے اس کے دروازے پر تالی ماری اور ان پورنا نے ظاہر ہو کر اس سے کہا کہ یہ راجا کون ہے؟ وہ بولی کہ راجا بکرم ہے، اس نے میری خدمت کی ہے اور میں نے اس سے قول ہارا ہے۔ اگر تیرے دل میں میری محبت ہے تو ان پورنا اسے دے۔ اس نے راجا کو ایک تھیلی دی اور کہا اس میں سے جتنی چیز کھانے کی مانگو گے، سب پاؤ گے۔ راجا نے تھیلی لے لی، وہاں سے خوش ہو کر ندی کے کنارے آ کر اشنان پوجا کر کے مطمئن بیٹھ گیا کہ ایک برہمن آ پہنچا۔ اس کو راجا نے بلایا اور کہا کہ کچھ کھاؤ گے؟ اس نے کہا مجھے بھوک لگی ہے، کچھ دو تو میں کھاؤں۔ راجا بولا کیا کھاؤ گے؟ تمھارا دل کیا کھانے کو چاہ رہا ہے؟ وہ بولا، اس وقت پکوان کھاؤں گا۔ راجا اپنے دل میں سوچنے لگا کہ اگر اس وقت پکوان نہ پہنچے گا تو میں برہمن کے سامنے جھوٹا ہوں گا۔ یہ بات دل میں سوچ کر تھیلی میں ہاتھ ڈال کر جو نکالا تو دیکھا کہ پکوان ہی نکلا۔"(۷)

"سنگھاسن بتیسی" کی پوہ پاؤلی آٹھویں کہانی میں ایک بڑھئی راجا کو لکڑی کا گھوڑا تحفہ دیتا ہے۔ راجا نے پوچھا اس کی کیا خوبی ہے؟ بڑھئی نے کہا مہاراج! کھانا پینا اس کی فطرت میں نہیں لیکن آپ جہاں جانا چاہتے ہیں۔ یہ گھوڑا آپ کو چند لمحوں میں پہنچا دے گا۔ راجا نے خوش ہو کر بڑھئی کو انعام واکرام سے نوازتا ہے۔ بڑھئی نے رخصت ہوتے وقت راجا کو نصیحت کی کہ مہاراج سوار ہو کر اس کو چابک نہیں مارنا۔ لیکن بد قسمتی سے ایک دن راجا نے اس گھوڑے پر سوار ہو کر غلطی سے چابک ماری تو گھوڑا غصے میں آ کر بجلی کی سی تیزی سے وہ راجا کو سمندر پار پہنچا دیتا ہے۔ کہانی میں اس طرح کے واقعات طلسماتی اور ماورائی حقیقت نگاری کا باعث بنتے ہیں۔ قدیم زمانے کے لوگ اڑن کھٹولا کی مثالیں بیان کرتے تھے۔ عہد جدید میں ہیلی کاپٹر، ہوائی جہاز اور جنگی جہاز فضاؤں میں حقیقی طور پر محو پرواز ہیں۔ راجا بکرماجیت کے دونوں سورما اگیا اور کویلا ان کو پلک جھپکتے منزل مقصود پر پہنچا دیتے ہیں۔ بکرماجیت کا سورماؤں کے ذریعے سفر کرنا اور ضرورت پڑنے پر ان کا بروقت مدد کے لیے حاضر ہو جانا قاری کو حیرت و ششدر میں ڈال دیتے ہیں۔ کیرت وتی بارہویں کہانی میں بکرماجیت کا تیل کے کڑاہے میں کود کر جل بھن جانا، جوگنیوں کا ان کے جسم کو نوچ کر کھا جانا اور کنگالن کا امرت ان کے جسم کی ہڈیوں پر چھڑک کر دوبارہ زندہ کرنا، دیوی کا راجا کو طلسماتی تھیلی دینا اور ان کا حاجت کے وقت رقم کا نکالنا طلسماتی حقیقت کو جنم دیتا ہے۔ عہد جدید میں سائنس فکشن تجرباتی اور مشاہداتی حقائق کو تسلیم کرتا ہے۔ الوپ وتی پندرہویں کہانی میں ریچھ اور شیر کا راجا کے بیٹے سے کلام کرنا جادوئی حقیقت کے زمرے میں لایا جا سکتا ہے۔ راجا کے بیٹے کا شیر اور ریچھ سے مکالمہ ملاحظہ ہو۔

> "رات ہوئی تو ریچھ بولا! راج کمار، اب رات ہو گئی ہے۔ یہ شیر ہم دونوں کا دشمن ہے، اس وقت

سونا جان کا نقصان کرنا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ رات کو دو دو پہر مل کر جاگتے ہیں۔ آدھی رات تو جاگ، آدھی رات میں جاگوں گا۔ راج کمار نے کہا! بہت اچھا۔ ریچھ نے کہا رات کے پہلے دو پہر تک تم سو رہو اور میں جاگتا ہوں اور رات کے دو پہر تم جاگنا تو میں سو جاؤں گا۔ دونوں نے آپس میں یہ طے کیا۔ راج کمار سو گیا اور ریچھ بیٹھ کر اس کا پہرا دینے لگا۔ ایسے میں شیر نے ریچھ سے کہا کہ میری بات سن اور بے وقوف نہ بن، یہ انسان ہماری خوراک ہے اور تو کیوں نفرت کا بیج بو رہا ہے؟ اسے نیچے ڈال دے اور ہم دونوں مل کر اسے کھائیں گے۔ یہ آدمی ہے اور ہم دونوں جنگل کے رہنے والے ہیں، ہاتھ میں آیا ہوا موتی دوبارہ ہاتھ نہیں لگتا۔ جب یہ جاگ اٹھے گا اور تو سو جائے گا تو وہ تیرا سر کاٹ کر پھینک دے گا۔ ریچھ نے جواب دیا کہ سن نادان شیر! اپنے اوپر الزام لینا مناسب نہیں، جتنا گناہ راجا کو مارنے کا ہوتا ہے یا درخت کے کاٹنے کا یا استاد سے جھوٹ بولنے کا یا جنگل کو جلانے کا اتنا ہی بھروسے کو توڑنے کا ہوتا ہے۔ بلکہ پناہ لینے والے کو مارنے کا تو ان سب سے زیادہ گناہ ہوتا ہے اور یہ گناہ کبھی معاف نہیں ہوتا۔" (۸)

سیتئوتی سترہویں کہانی میں راجا بکرم ماجیت کو شیش ناگ رخصت کرتے ہوئے چار لعل دیتا ہے۔ ان چاروں موتیوں کی خوبیاں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں۔ شیش ناگ چار لعلوں کی صفات اس طرح بیان کرتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں۔

"تب شیش ناگ نے ہنس کر کہا! راجا اب تمھیں گھر جانے کی خواہش ہوئی ہے۔ تو کچھ تحفہ بھی تمھیں دیتے ہیں، تم لیتے جاؤ۔ یہ کہہ کر چار لعل منگوا کر راجا کو دیے اور ان کی خوبیاں بیان کرنے لگا کہ ایک لعل کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا زیور چاہو گے، تمھیں دے گا اور دیتے ہوئے تاخیر نہ کرے گا، دوسرے لعل کا یہ وصف ہے کہ ہاتھی گھوڑے پالکیاں جتنی بھی تم منگواؤ گے، اتنی ہی اس سے پاؤ گے اور تیسرے موتی کی یہ خوبی ہے کہ جتنی دولت چاہو گے، یہ دے گا۔ چوتھے موتی میں یہ تاثیر ہے کہ بہت بھجن اور بھلائی کے کام کی جتنی خواہش رکھو گے، اتنی ہی یہ پوری کرے گا۔ اس طرح سے راجا کو چاروں لعلوں کی خوبیاں سمجھا کر بتائیں اور اسے رخصت کیا۔" (۹)

روپ ریکھا پتلی کی اٹھارویں کہانی میں ایک جوگی خوش ہو کر راجا کو ایک کھرے کا ڈھیلا دیتا ہے۔ جب راجا اس کی خوبیوں کے بارے میں پوچھتا ہے تو جوگی نے کہا مہاراج! دن کے وقت جو کچھ کھرے سے تحریر کریں گے رات کو ان چیزوں کا حقیقی مشاہدہ کر سکیں گے۔ راجا نے جوگی کی باتیں سن کر ایک محل جھاڑ پونچھ کر اس میں بستر بچھوایا۔ دن کو محل کے دروازے بند کر کے دیواروں پر کھرے کے ساتھ کچھ تصاویر کھینچی۔ جب رات ہوئی تو دیوار پر بنائی گئی تمام تصاویروں نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ دیواروں پر کھینچی گئی تصاویر چلنے پھرنے اور بولنے لگیں۔ راجا یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ اس منظر نامے کو روپ ریکھا میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

"راجا نے ایک محل خالی کروایا جھاڑ پونچھ کروا کر اکیلا اس گھر میں جا کر بستر بچھایا اور دروازے بند کر کے دیواروں پر تصویریں بنانے لگا۔ پہلے کرشن جی کی تصویر بنائی، پھر سرستی کی، پھر دوسرے دیوتاؤں کی۔۔۔ اتنے میں شام ہو گئی اور اچانک ہر طرف سے جے جے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جن دیوتاؤں کی تصویریں بنائی تھیں، وہ صاف دکھائی دیے اور دیکھتے ہی راجا ساکت و جامد ہو گیا۔ جو باتیں وہ آپس میں کرتے تھے، راجا سب سن رہا تھا۔ لیکن خوف کے مارے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ پھر راجا نے دوسری دیوار میں ہاتھ، گھوڑے، پالکی، رتھ اور فوجی وغیرہ یہ سب کچھ بنایا۔ جب رات ہوئی تو وہ سب حاضر ہوئے۔ راجا ان سب کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا اور جوگی کو یاد کر رہا تھا کہ جو اسے یہ سوغات دے گیا۔ جب صبح ہوئی تو یہ سب کچھ تصویروں میں بدل گیا۔ تیسرے دن راجا نے باجے اور ساز بنائے، پھر گانے بجانے والے بنائے، پھر خوب صورت عورتیں بنائیں، تال، بین، رباب، تنبور، مورچنگ، پناگ، بانسری، کرتال، الغوزہ وغیرہ۔ ایک ایک ساز کی تصویر ہاتھ بڑھا بڑھا کر بنائی۔ جب رات ہوئی تو پہلے ایک شبدہ ہوا اور گانے بجانے والے موسیقی کے طریقوں سے گانے لگے۔ تمام ساز مکمل طور پر سروں کے ساتھ بجنے لگے اور وہ تمام حسینائیں بھی ناچنے لگیں اور ناز و انداز دکھانے لگیں۔"(۱۰)

کرناوتی تئیسویں کہانی میں وزیر اشنان کرتے ہوئے۔ ایک خوبصورت پھول کو پانی میں بہتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو پکڑ کر راجا کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کر دیتا ہے۔ راجا پھول کو دیکھ کر بہت خوش ہو جاتا ہے اور ان کو وزارت کا عہدہ سونپ دیتا ہے۔ راجا نے وزیر کو حکم دیا اس پھول کا درخت بھی مجھے لا کر دیں تا کہ مزید پھول حاصل کر سکوں۔ وزیر حکم کی بجا آوری کے لیے عازم سفر ہوتا ہے۔ کئی دن مسلسل سفر کرنے کے بعد ایک وسیع و عریض جنگل میں پہنچ جاتا ہے۔ ان کو پہاڑ کے دامن میں ایک مندر دکھائی دیتا ہے۔ ان کو مزید ندی میں پھول تیرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ جن کو پا کر خوش ہو جاتا ہے۔ وزیر جب مندر میں داخل ہوتا ہے تو اس کو ایک جوگی پاؤں میں زنجیر باندھے درخت سے الٹا لٹکا ہوا جوگی نظر آتا ہے۔ ان کے جسم سے جو خون کا قطرہ جو ندی میں گرتا ہے۔ اس سے ایک پھول وجود میں آتا ہے۔ یہ اچنبھا دیکھ کر وزیر اپنے واپس لوٹ آتا ہے۔ چترکلا ں چوبیسویں کہانی میں چھ رانیاں رات کے اندھیرے میں جوگی کے پاس مٹھائی اور پکوان راجا سے چھپ کر لے جاتی ہیں۔ جوگی مراقبے سے فارغ ہو کر کھانا کھانے کے بعد چھ اجسام میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ہر جسم ایک رانی سے وصل کرتا ہے۔ "سنگھاسن بتیسی" کی کہانیوں کے تمام کردار طلسماتی اور مافوق الفطرت عناصر مشتمل دکھائی دیتے ہیں۔

"بیتال پچیسی" کے تمام قصے جادوئی حقیقت نگاری اور ماورائی حقیقت کا پرتو نظر آتے ہیں۔ اس کی دوسری کہانی میں برہمن کی بیوی اپنے لڑکے کو جلتے ہوئے چولہے میں پھینک دیتی ہے۔ مہمان ان کے اس وحشیانہ عمل کو دیکھ کر کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ خانہ دار کو جب اس کی خبر ملتی ہے تو وہ مردوں کو حیات بخشنے والی کتاب لا کر کچھ منتر پڑھتا ہے تو اس کا بیٹا زندہ ہو جاتا ہے۔ مہمان ان کے اس عمل کو دیکھ

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

حیران ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کتاب کو حاصل کر کے اپنی محبوبہ کو جلا دوں۔ مہمان اپنی اس خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رات کو ان کے گھر قیام کرتا ہے۔ رات کی تاریکی میں منتر والی کتاب چرا کر واپس روانہ ہو جاتا ہے اور مرگھٹ کی جگہ پہنچ کر برہمن کی بیٹی کو زندہ کر دیتا ہے۔ "بیتال پچیسی" کی تیسری کہانی میں بھی بیر بر پہلے اپنے بیٹے کی تلوار سے گردن اڑا کر دیوی کی بھینٹ چڑھاتا ہے۔ بھائی کو اس طرح مرتے دیکھ کر ان کی بہن بھی اپنی گردان اڑا دیتی ہے۔ اس کے بعد بیر بر اور اس کی بیوی بھی دیوی کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ جب راجا نے ان کی یہ قربانی دیکھی، تو خود بھی دیوی کی بھینٹ چڑھنے کے لیے تلوار اٹھائی ہی تھی۔ دیوی نے فوراً زندہ ہو کر ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا! میں تیری دلیری پر خوش ہوں اور آپ کیا چاہتے ہیں؟ انھوں نے کہا اگر آپ مجھ سے خوش ہیں تو ان چاروں کو زندہ کر دیں۔ دیوی نے ان چاروں کو زندہ کر دیا۔ "بیتال پچیسی" کی چوتھی کہانی میں طوطا عجیب و غریب حالات و واقعات بیان کرتے نظر آتا ہے۔ راجا جب طوطے سے رائے لیتا ہے کہ ایسی حسین و جمیل عورت کہاں ہو گی جو میرے لائق ہو۔ طوطا اس بارے میں ان کو آگاہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> "ایک دن راجا نے اسی طوطے سے پوچھا کہ تو کیا کیا جانتا ہے؟ تب طوطا بولا کہ مہاراج! میں سب کچھ جانتا ہوں۔ راجا نے کہا جو تو سب کچھ جانتا ہے تو بتا کہ میرے پائے کی حسین عورت کہاں رہتی ہے؟ تب اس طوطے نے کہا مہاراج! مگدھ دیس میں مگدھیشو نامی راجا ہے اور کی بیٹی چندر اوتی ہے۔ تمھاری شادی اس کے ساتھ ہو گی اور وہ بے حد حسین اور عالمہ فاضلہ ہے۔ راجا نے طوطے کی یہ بات سن کر اس چندر کرانت نامی ایک نجومی کو بلا کر پوچھا کہ ہمارا بیاہ کس لڑکی سے ہو گا؟ اس نے بھی اپنے نجوم کے علم سے معلوم کر کے کہا! چندر اوتی نام کی ایک لڑکی ہے اسی کے ساتھ تمہاری شادی ہو گی۔ یہ بات سن کر راجا نے ایک برہمن کو بلوایا اور سب کچھ سمجھا کر راجا مگدھیشو کے پاس بھیجتے ہوئے کہا! اگر ہمارے بیاہ کی بات پکی کر آؤ گے تو ہم تمھیں خوش کریں گے۔"(۱۱)

راجا طوطے کی باتیں سن برہمن کو احوال کے لیے روانہ کرتا آخر کار راجا کی اس راج کماری سے شادی ہو جاتی ہے اور رانی اپنی مینا بھی ساتھ لے آتی ہے۔ راجا راجکماری کو کہتا ہے کہ طوطا اور مینا کو ایک ہی پنجرے میں بند کر دیتے ہیں۔ طوطا جب مینا کو اپنے پاس پاتا ہے تو ان سے وصل کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن مینا اس کی اس خواہش کو ٹھکرا دیتی ہے۔ اس حوالے سے طوطا اور مینا کا مکالمہ ملاحظہ ہو۔

> "چند روز کے بعد راجا اور رانی آپس میں بیٹھے کچھ باتیں کر رہے تھے کہ طوطا مینا سے کہنے لگا کہ دنیا میں وصل ہی اصل ہے اور جس نے دنیا میں پیدا ہو کر وصل نہیں کیا اس کا جنم ناطق ہو گیا۔ اس لیے تو مجھ کو وصل کرنے دے۔ یہ سن کر مینا بولی! مجھے نر کی تمنا نہیں۔ تب اس نے پوچھا کس لیے؟ مینا بولی کہ مرد گناہ گار، بداخلاق، دھوکے باز اور عورت کو گھائل کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ سن کر طوطے نے کہا! کہ عورت بھی دغاباز، جھوٹی، بے وقوف، لالچی اور خونی ہوتی

ہے۔جب اس طرح سے دونوں جھگڑنے لگے تو راجا نے پوچھا! تم آپس میں کس لیے جھگڑ رہے ہو؟ مینا بولی! مہاراج! مرد ظالم اور عورت کو اذیت دینے والے ہوتے ہیں۔اس لیے مجھے نر کی ضرورت نہیں۔مہاراج! میں ایک بات بتاتی ہوں اور آپ سنیئے کہ مرد ایسے ہوتے ہیں۔"(۱۲)

"بیتال پچیسی" کی چھٹی کہانی میں راجا دھرم شیل بے اولاد تھا اور اس کے وزیر کا نام اندھک تھا۔انھوں نے ایک دن راجا سے کہا مہاراج! مندر بنوا کر دیوی کی پوجا کریں اور آپ کی دلی مراد بر آئے گی۔راجا نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے مندر بنوا کر اس ایک دیوی کو بٹھایا اور شب و روز اس کی پوجا پاٹ شروع کر دی۔ایک دن راجا نے مندر میں دیوی کے سامنے التجا کی کہ میری مدد کریں۔اچانک دیوی کے مندر سے آواز آئی تو کیا چاہتا ہے؟ مراد مانگ تیری مراد پوری کر دی جائے گی۔انھوں نے عرض کیا کہ اے ماں! اگر تو مجھ سے خوش ہے تو مجھے ایک بیٹا عنایت کریں۔دیوی نے کہا! راجا تیرے ہاں ایک طاقت ور اور صاحب کمال بیٹا پیدا ہو گا۔راجا نے جب یہ بات سنی تو دیوی پر صندل، کشت اور پھول چڑھائے۔کچھ عرصے کے بعد راجا کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔جب بڑا ہوا تو ایک دن اپنے دوست دھوبی کے بیٹے کے ساتھ شہر آ رہا تھا۔راستے میں ایک مندر دیکھ کر دھوبی کے بیٹے نے دیوی کو ڈنڈوت کیا۔تاہم جب مندر کے باہر نکلا تو خوبصورت لڑکی اچانک کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا۔دھوبی کے بیٹے نے کہا! دیوی اگر اس سے میری شادی ہو جائے تو میں اپنا سر تجھے چڑھاؤں گا۔چند روز بعد دھوبی کے بیٹے کی شادی اس دوشیزہ سے ہو جاتی ہے۔کچھ عرصے کے بعد دھوبی کا بیٹا اپنی بیوی اور دوست کے ساتھ دیوی کے درشن کو آیا۔مندر کے قریب بیوی اور دوست کو کہا آپ ٹھہریں میں دیوی کو ڈنڈوت کر کے آتا ہوں۔وہ مندر میں گیا اور دیوی کے سامنے اپنی گردن تلوار کے ذریعے اڑا دی۔تھوڑی دیر بعد دوست دیکھنے آیا تو اس کو مردہ پا کر اپنی گردن بھی دیوی کی بھینٹ چڑھا دی۔یہ سارا منظر دیکھ کر عورت نے بھی اپنی گردن پر تلوار چلانے کی کوشش کی تو دیوی نے تخت سے اتر کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا میں تم سے خوش ہوں مراد مانگ تیری مراد بر آئے گی۔عورت نے کہا ان دونوں کو زندہ کر دیں۔دیوی نے دونوں کو فوراً زندہ کر دیا۔

آٹھویں کہانی میں راجا نے راجکمار کو سمندر کے کنارے روانہ کیا۔اس نے راستے میں ایک مندر دیکھ کر پوجا کرنے کے لیے داخل ہوا۔لیکن جب باہر نکلا تو اس کی ملاقات ایک حسینہ سے ہوئی۔اس کو دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔حسینہ نے راجکمار سے پوچھا تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ راجکمار نے کہا عیش و عشرت کے لیے یہ سن کر عورت نے کہا! پہلے تالاب میں جا کر اشنان کریں پھر تیری خواہش پوری ہو گی۔راجکمار یہ سن کر تالاب میں گھس گیا جب باہر نکلا تو اپنے شہر پہنچ چکا تھا۔اس حوالے سے اقتباس دیکھیے۔

"غرض ایک دن راجا نے راجکمار کو کسی کام کے لیے سمندر کے کنارے بھیجا۔وہ جب کنارے پر پہنچا تو اس نے ایک دیوی کا مندر دیکھا۔یہ اس میں گیا اور دیوی کی پوجا کی لیکن جب وہاں سے نکلا، تو وہیں اس کے پیچھے ایک خوب صورت عورت آ کر پوچھنے لگی، اے شخص! تو یہاں کس لیے آیا ہے؟ وہ بولا! عیش و عشرت کے لیے آیا ہوں اور تیرے حسن کو دیکھ کر میں مفتون ہوا ہوں۔اس نے کہا! اگر تو مجھ سے کچھ ارادہ رکھتا ہے تو پہلے تالاب میں جا کر اشنان کر، پھر اس کے

بعد تو جو کہے گا، سو میں سنوں گی۔ یہ سنتے ہی وہ کپڑے اتار کر تالاب میں گھس گیا اور غوطہ مار کر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ اپنے ہی شہر میں کھڑا ہے۔ اس اچنبھے کو دیکھ کر وہ فوراً خوف زدہ ہو گیا اور لاچار اپنے گھر گیا۔"(۱۳)

"بیتال پچیسی" کی تمام کہانیاں ماؤرائی اور مافوق الفطرت عناصر پر مبنی ہیں۔ گیارہویں کہانی میں وزیر کسی کام کے سلسلے میں سمندر کے کنارے عازم سفر ہوتا ہے۔ اچانک اس کے سامنے سمندر میں سونے کا ایک درخت ظاہر ہوتا ہے۔ اس عجیب و غریب درخت کے پتے زمرد، پھول پکھراج اور پھل مونگے مرجان کے تھے۔ اس درخت پر نہایت ایک حسین و جمیل عورت بین ہاتھ میں لیے میٹھے سروں سے گا رہی تھی۔ وزیر واپس آکر اس کا تذکرہ راجا سے کرتا ہے۔ یہ سن کر راجا حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور اس ناقابل واقعہ کی تحقیق کے لیے کر سمندر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اقتباس دیکھیے۔

"مہاراج! جہاں رگھوناتھ جی نے سمندر پر پل باندھا ہے، وہاں جا کر دیکھتا کیا ہوں کہ سمندر میں ایک سونے کا درخت نکلا کہ جس کے زمرد کے پتے تھے، پکھراج کے پھول اور مونگے کے پھلوں سے ایسا خوب لدا ہوا تھا کہ جس کا بیان نہیں کیا ہو سکتا اور اس پر بے حد حسین عورت بین ہاتھ میں لیے میٹھے میٹھے سروں سے گا رہی تھی۔ لیکن ایک لمحے کے بعد وہ درخت سمندر میں چھپ گیا۔"(۱۴)

چودھویں کہانی میں مول دیوی کی ملاقات برہمن کے لڑکے سے ہوتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر دیو پوچھتا ہے کیا بات ہے اور کیوں پریشان ہو؟ لڑکا کہتا ہے اے ششی لڑکی کی محبت نے بے سدھ کر دیا ہے۔ مول دیو یہ سن کر اس کو دو گٹکے دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب ایک گٹکے کو منھ میں رکھے گا تو بارہ برس کی لڑکی کا روپ دھار لے گا اور جب گٹکا منھ سے نکالے گا تو مرد کی شکل میں لوٹ آئے گا۔ اس طرح دوسرا گٹکا جب منھ میں رکھے گا تو اسی برس کا بوڑھا نظر آئے گا اور منھ سے جب گٹکا نکالے گا تو اصلی صورت میں لوٹ آئے گا۔ برہمن کا لڑکا یہ دونوں گٹکے لے کر مول دیو کے ساتھ راجا کے پاس حاضر ہو جاتا ہے۔ مول دیو راجا کو کہتا ہے کہ میری بہو کے لیے محل میں رہائش کا بندوبست کریں تا کہ میں اپنے گمشدہ بیٹے کو تلاش کر کے لے آؤں۔ راجا نے اپنی بیٹی کو بلا کر کہا! اس برہمن کی بیٹی کی خوب خاطر مدارت کریں اور اپنے سے جدا مت کرنا۔ یوں برہمن کی بہو (لڑکا) شب و روز راجکماری کے ساتھ رہتا۔ ایک دن برہمن کی بہو (لڑکا) راجکماری سے کہتا ہے۔ آپ کیوں پریشان رہتی ہیں؟ اس نے بتایا میں برہمن لڑکے کی یاد میں جل رہی ہوں۔ برہمن کی بہو نے کہا اگر میں اس سے آپ کی ملاقات کروادوں، تو مجھے اس کا صلہ کیا ملے گا۔ راجکماری نے کہا اگر ایسا ممکن ہے تو میں تاحیات آپ کی غلام رہوں گی۔ ان کی یہ باتیں سن کر برہمن کی بہو نے منھ سے گٹکا نکالا تو مرد بن گیا۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

"یہ سن کر اس برہمن کی بہو بولی، جو میں تیرے محبوب کو ملا دوں تو، تو مجھے کیا دے گی؟ راج کماری بولی کہ سدا تیری غلام رہوں گی۔ یہ سن کر وہ گٹکا منھ سے نکالا کے پھر مرد ہو گیا اور یہ اسے دیکھ کر شرمائی۔ پھر اس برہمن کے لڑکے نے گندھرب بیاہ کے طریقے سے اس کے ساتھ

اپنا بیاہ کیا اور ہمیشہ اسی طرح رات کو مرد بن جاتا اور دن کو لڑکی۔ آخر کار چھ مہینے کے بعد راج کماری امید سے ہوئی۔" (۱۵)

برہمن لڑکے کا دن کو عورت اور رات کو عورت کا روپ دھار لینا قاری کے لیے ناقابل یقین کیفیت کو جنم دیتا ہے۔ گنگے کا کردار بھی طلسماتی حقیقت کا باعث بن جاتا ہے۔ "بیتال پچیسی" کے کردار حکمت و دانائی کے باعث سنگھاسن پچیسی سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ بکرماجیت کا کردار بھی طلسماتی حقیقت نگاری کا سبب بنتا ہے۔ "بیتال پچیسی" کے قصے ایک لڑی میں پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا مثالیہ انداز ناقابل یقین ہونے کے ساتھ حقیقت پسندانہ اور قاری کے لیے حیرت انگیز ثابت ہوتا ہے۔ سنگھاسن پچیسی کی پتلیاں بھی عجیب و غریب واقعات کے ذریعے راجا کو پریشان رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں سیاسی دانش مندی کی مخصوص علامتی معنویت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان داستانوں میں سچائی، بہادری، غیرت مندی کو اخلاص کی پیوند کاری سے بیان کیا گیا ہے۔ قاری کے ذہن میں کہانیوں کے مختلف کردار پوری حقیقت کے ساتھ نصیحت آموز طریقے سے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں دانش مندی کے لازوال اور دائمی ماورائی عناصر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن "بیتال پچیسی" کی آخری پانچ کہانیاں قاری کے لیے چاشنی اور حیرت کا باعث نہیں بنتی کیوں کہ ان میں طلسماتی عناصر کی بجائے بوجھل پن کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ قصہ مختصر س "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں مافوق الفطرت اور ماورائی عناصر طلسماتی حقیقت نگاری کا موجب بنتے ہیں۔ اردو داستانوں میں ہر عمل یا حرکت کا تعلق واسطہ یا بالواسطہ حال اور ماضی سے جڑا نظر آتا ہے۔ لیکن جادوئی حقیقت نگاری کے بیانیہ کو تکنیکی لحاظ سے کہانی کی بنت میں جذبات، احساسات اور کیفیات کو کہانی نویس مافوق الفطرت انداز سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری اس کو یقین سمجھ کر حقیقت تسلیم کر لیتا ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری پر مشتمل عناصر قاری کے لیے شعور حیات کے ساتھ ساتھ نشاط و مسرت کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، فلیپ، سنگھاسن بتیسی، مرتبہ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۹ء

۲۔ کاظم علی جوان، للولال کوی، سنگھاسن بتیسی، مرتبہ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۹

۳۔ ایضاً، ص ۱۴

۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو ادب کی نثری داستانیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو بھارت، ۱۹۸۶ء، ص ۳۸۰

۵۔ ایضاً، ص ۳۹۸

۶۔ کاظم علی جوان، للولال کوی، سنگھاسن بتیسی، مرتبہ ڈاکٹر بصیرہ عنبرین، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۷۷

۷۔ ایضاً، ص ۷۷

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۴

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۸

۱۰۔ ایضاً، ص۱۴۳

۱۱۔ بصیرہ عنبرین، ڈاکٹر، بیتال پچیسی، دار لنوادر، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۴۵

۱۲۔ ایضاً، ص۴۶

۱۳۔ ایضاً، ص۷۰

۱۴۔ ایضاً، ص۷۹

۱۵۔ ایضاً، ص۹۲

References in Roman Script:

1. Najeeb Jamal, Dr. Flap, Singha sen Bateesi, Murtaba, Dr. Basera Ambreen, Dar ul Nawader, Lahore,2019
2. Kazim Ali Jawan, Lalu lal Kawi, Singha sen Bateesi, Murtaba, Dr. Basera Ambreen, Dar ul Nawader, Lahore, 2019, p.9
3. Ibid, p.14
4. Ghian Chand,Dr,Urdu adab ki Nasri Dastaany,Uter Pardesh Urdu Academi,Lakhnu, Bahrat,1986, p.380
5. Ibid, p.398
6. Kazim Ali Jawan,Lalu lal Kawi, Singha sen Bateesi,Murtaba , Dr.Basera Ambreen, Dar ul Nawader,Lahore,2019, p.77
7. Ibid, p.77
8. Ibid, p.124
9. Ibid, p.138
10. Ibid, p.143
11. Baseera Ambreen, Dr., Beetaal Pachesi, Daar- ul –Nawader,Lahore,2017, p .45
12. Ibid, p.46
13. Ibid, p.70
14. Ibid, p.79
15. Ibid, p.92

Dr. Muhammad Ramzan is a Lecturer at the Center of Excellence, Government Higher Secondary School, Jaranwala, Pakistan. He earned his PhD from the National University of Modern Languages, Islamabad. He has authored two books and published eleven articles. Dr. Ramzan is the recipient of the Mehkan Adbi Award 2024 and the F.J. Pakistan Writer Forum Adbi Award 2024. His research interests include Urdu fiction and poetry.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 28th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.415

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں ثقافتی تصادم کا لسانی اظہار: ایک بین الثقافتی مطالعہ

Linguistic Representation of Cultural Conflict in the Short Stories of Tahira Iqbal: An Intercultural Study

DR. GHAZAL YAQUB[1] AND DR. MUHAMMAD AMJAD[2]

[1] Teaching Research Associate, Department of Urdu, International Islamic University, Islamabad, Pakistan.
[2] PhD Urdu Alumni, NUML, Islamabad, Pakistan.
Corresponding author: Ghazal Yaqub (ghazal.yaqub@iiu.edu.pk)

ABSTRACT This research investigates the lexical and cultural tensions in the short stories of Tahira Iqbal, focusing on how language operates as a site of identity, resistance, and transformation in an era of globalization. The study begins by addressing the increasing marginalization of indigenous languages and cultures in literary discourse, a trend often overshadowed by the dominance of global languages such as English. While prior scholarship has explored linguistic hybridity in postcolonial literature, there remains a gap in examining how rural and regional voices navigate globalization from within the Pakistani literary context. This paper fills that gap by examining Tahira Iqbal's unique position as a writer deeply rooted in local traditions yet responsive to global influences. Employing a qualitative textual analysis method, the study analyzes selected short stories through the lens of sociolinguistic theory and intercultural literary criticism. Findings reveal that Iqbal's hybrid linguistic style blending English with local vernaculars along with her culturally embedded storytelling, captures the complex interplay between global cultural codes and indigenous identities. Her narratives expose the socio-linguistic divide between urban elites, who increasingly embrace English, and rural communities, who preserve their mother tongues. The results underscore how Iqbal resists cultural homogenization, using language to foreground intercultural struggle and advocate for linguistic and cultural diversity. This research positions her as a critical voice in contemporary literature, challenging dominant narratives of globalization while reaffirming the value of local identity in literary expression.

Keywords Cultural, Globalization, Linguistic, Cultural diversity, Homogenization.

عصری اردو ادب کی ایک ممتاز شخصیت طاہرہ اقبال نے پاکستانی ثقافت کے مختلف رنگوں کو اپنے افسانوں میں بُنا ہے۔ اُن کی مختصر کہانیاں پاکستانی معاشرے کی کثیر جہتی ثقافتی حرکیات کی عکاسی کرتی ہیں، خاص طور پر پنجاب کے دیہی مناظر پر زور دیتی ہیں۔ اپنی باریک بینی کے ذریعے، طاہرہ اقبال نے مقامی روایات، رسوم و رواج اور ان موروثی تنازعات کو اپنی گرفت میں لے کر ان روایات کو جدیدیت سے جوڑ دیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ثقافتی تنازعات کی تصویر کشی میں زبان کو ایک اہم ٹول کے طور پر استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے

***This work** is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)*

کرداروں اور ترتیبات کو صداقت فراہم کرنے کے لیے علاقائی بولیوں اور مقامی بول چال کا استعمال کرتی ہیں۔ یہ لسانی انتخاب نہ صرف بیانیہ کو تقویت بخشتا ہے بلکہ مقامی روایات اور بیرونی اثرات کے درمیان سماجی و ثقافتی تناؤ کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

لسانی بشریات کا تصور طاہرہ اقبال کی تخلیقات میں واضح ہے، جہاں زبان ثقافتی اظہار اور شناخت کی تشکیل کے لیے ایک راستے کا انتخاب کرتی ہے۔ ان کے افسانوں میں مقامی بولیوں اور ثقافتی علامتوں کو یکجا کر کے پیش کیا گیا ہے اس طرح وہ اپنے قارئین کو ایک عمیق تجربہ فراہم کرنے میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں مقامی ثقافت کے موضوعات اور عالمگیریت کے درمیان ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنے کے چیلنجوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کے کردار جدید معاشرتی تبدیلیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے روایتی اقدار کو برقرار رکھنے کی پیچیدگیوں کو بیان کرتے ہیں، جو عصری ادب میں ثقافتی تحفظ اور موافقت پر وسیع تر گفتگو کی عکاسی کرتے ہیں۔ جنوبی ایشائی ادب کے وسیع تر تناظر میں، زبان اور ثقافت کے درمیان تعامل ایک بار بار چلنے والا موضوع ہے۔ مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ جنوبی ایشائی مختصر کہانیوں میں ذولسانی اور کوڈ کی تبدیلی ثقافتی عناصر کی عکاسی کو بڑھاتی ہے، جس سے قارئین کرداروں کے تجربات کے ساتھ مزید گہرائی سے مشغول ہوتے ہیں۔ یہ تکنیک طاہرہ اقبال کے نقطہ نظر سے واضح ہوتی ہے، کیونکہ وہ اپنے افسانوں کی پیش کش میں مقامی لسانی عناصر کو بغیر کسی رکاوٹ کے مربوط کرتی ہیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانے عالمگیریت کے تناظر میں لسانی اور ثقافتی تناؤ کی متحرک تحقیق کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کے افسانون میں زبان محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں بلکہ شناخت، مزاحمت اور تبدیلی کی ایک مضبوط علامت کے طور پر ابھرتی ہے۔ اشرافیہ اور دیہی یا پسماندہ طبقات کے مابین تفریق کو نمایاں کرتے ہوئے، ان کے افسانے ایک گہرے ثقافتی اور شناختی بحران کو آشکار کرتی ہیں جو صرف الفاظ اور قواعد تک محدود نہیں رہتا۔ انگریزی اور مقامی زبانوں کا شعوری امتزاج ایک ایسا ہائبرڈ بیانیہ تشکیل دیتا ہے جو مقامی روایات اور عالمی اقدار کے درمیان موجود کشمکش کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح ان کا تخلیقی عمل ایک ادبی میدانِ کارزار کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جہاں عالمگیریت کی ہم آہنگ قوتوں کو فعال انداز میں چیلنج کیا جاتا ہے۔

عصری اردو ادب میں ایک نمایاں آواز کے طور پر، طاہرہ اقبال پاکستان کی پیچیدہ ثقافتی ساخت کو فکشن کے ذریعے بُننے کی کوشش کرتی ہیں، بالخصوص پنجاب کے دیہی مناظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ثقافتی حرکیات سے لبریز ہیں جو روایت اور جدیدیت کے باہمی تعامل کو کامیابی سے گرفت میں لیتی ہیں۔ مقامی رسوم و رواج اور سماجی ڈھانچوں کے حوالے سے ان کی گہری حساسیت ان کے تخلیقی عمل کو نیا زاویہ عطا کرتی ہے، جس کے ذریعے وہ اندرونی اور بیرونی تنازعات کو اجاگر کرتی ہیں جو جدید پاکستانی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی تناظر انہیں دیہی روایات کو جامد مظاہر کے بجائے ارتقائی ثقافتی عناصر کے طور پر پیش کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جو جدید اثرات کے ساتھ ایک مسلسل مکالمے میں مصروف ہیں۔

بین الثقافتی ادب میں ثقافتی تصادم ایک اہم موضوع کے طور پر نمایاں ہوتا ہے، جو مقامی روایات اور بیرونی ثقافتی اثرات کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ عنصر طاہرہ اقبال جیسی افسانہ نگاروں کے تخلیقی ادب میں بطور خاص نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں وہ کردار سامنے آتے ہیں جو اقدار کے تصادم، لسانی تغیرات، اور بیرونی طور پر مسلط کردہ شناختوں کے باعث گہرے

نفسیاتی اور سماجی کشمکش کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ صورتحال اس امر کی عکاسی کرتی ہے کہ ذاتی اور اجتماعی شناختیں کس طرح موروثی ثقافت اور جدید تبدیلیوں کے درمیان الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ ثقافتی تصادم محض فکری یا عملی سطح پر محدود نہیں بلکہ اس کا اظہار زبان اور بیانیہ کی سطح پر بھی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔

محسن حامد کے معروف ناول The Reluctant Fundamentalist میں ثقافتی تصادم کو مؤثر طور پر پیش کیا گیا ہے، جہاں مرکزی کردار چنگیز اپنی دوہری شناخت کے بحران کا سامنا کرتا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> "The novel contrasts Changez's dynamic, sophisticated character with the static, impoverished representation of Pakistan often portrayed through Western lenses, as seen in the depiction of Lahore as a city stuck in time (Hamid, 2007, p. 5). Changez defies these stereotypes by showcasing his intelligence, ambition, and deep knowledge of both Eastern and Western cultures, which enable him to succeed academically at Princeton and professionally at Underwood Samson (Hamid, 2007, p. 11; p. 121). His ability to navigate American society while maintaining his cultural identity underscores his resistance to imposed stereotypes and reflects the complexities of cultural integration and the lingering effects of colonization"(۱)

یہ اقتباس اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ ثقافتی شناخت نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی سیاق میں ایک مزاحمتی مقام اختیار کر لیتی ہے۔ اسی نوع کی مزاحمت طاہرہ اقبال کے کرداروں میں بھی دکھائی دیتی ہے، جو سماج کی غالب اقدار، خصوصاً پدرانہ اور مغربی اصولوں پر مبنی توقعات، کو چیلنج کرتے ہیں۔ یہ کردار ثقافتی جڑوں سے وابستگی اور داخلی مضبوطی کے ذریعے اپنی اصل شناخت کی بازیافت اور توثیق کرتے ہیں۔ لسانی سطح پر بھی ثقافتی تصادم کا اظہار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ عبدالستار ملک کے مطابق:

> "بولنے کے بہت سے طریقے ہیں اور بولنے کا ہر طریقہ ایک تنوع ہے۔ مثلاً مختلف لہجے اور بولیاں اس طرح کی تفریق کی بنیاد سماجی، تاریخی، مقامی یا ان سب کا مجموعہ ہو سکتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ کسی بھی زبان میں تنوع اور تغیر کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں"(۲)

یہ اقتباس اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زبان نہ صرف ایک ابلاغی ذریعہ ہے بلکہ یہ سماجی، تاریخی اور علاقائی شناختوں کی علامت بھی ہے۔ طاہرہ اقبال کی کہانیوں میں مقامی لہجوں، محاورات، اور عوامی اندازِ گفتگو کا استعمال نہ صرف ان کے افسانوں کی حقیقت نگاری کو تقویت دیتا ہے بلکہ یہ غالب لسانی و ثقافتی بیانیے کے خلاف ایک تہذیبی مزاحمت کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے۔ وہ زبان کی معیاری اور مقتدر شکل کو چیلنج کرتے ہوئے دیہی اور علاقائی آوازوں کو ادبی منظرنامے پر ایک باوقار مقام عطا کرتی ہیں، جس سے زبان خود ایک ثقافتی میدانِ کارزار بن جاتی ہے۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی طاہرہ اقبال کے تخلیقی متون اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ ثقافتی تصادم محض کرداروں کی داخلی کشمکش تک محدود نہیں، بلکہ یہ بیانیے، زبان، اور شناخت کی بُنت میں بھی سرایت کر جاتا

ہے۔ ان کا ادب نہ صرف مابعد نو آبادیاتی سیاق میں شناخت کے سوالات کو اجاگر کرتا ہے بلکہ یہ بین الثقافتی مباحثے کو وسعت دینے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ زبان ان کے تخلیقی عمل میں بیانیہ کی ایک کلیدی تکنیک کے طور پر نمایاں ہوتی ہے، جسے وہ ثقافتی تصادمات کی مؤثر عکاسی کے لیے شعوری طور پر بروئے کار لاتی ہیں۔ طاہرہ اقبال کا علاقائی لہجوں اور مقامی بول چال کے اظہارات کا استعمال ان کے کرداروں میں نہ صرف صداقت پیدا کرتا ہے بلکہ انہیں ان کے سماجی سیاق و سباق میں مضبوطی سے پیوست بھی کرتا ہے۔ ان کے لسانی انتخاب صرف حقیقت نگاری تک محدود نہیں بلکہ وہ مقامی و عالمی تناؤ، گہرے ثقافتی رویّوں اور بدلتی ہوئی خارجی دنیا کے درمیان ربط و تصادم کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان کی لسانی حکمت عملی اس ادراک کی مظہر ہے کہ زبان نہ صرف ایک ثقافتی خزانہ ہے بلکہ جدوجہد کا ایک میدان بھی ہے۔

جنوبی ایشیائی ادب کے وسیع تناظر میں، طاہرہ اقبال کی بیانیہ تکنیک اُن ابھرتے ہوئے ادبی رجحانات سے ہم آہنگ نظر آتی ہے جو ثقافتی نمائندگی کے ذرائع کے طور پر دو لسانیت اور کوڈ سوئچنگ کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا تخلیقی عمل یہ ظاہر کرتا ہے کہ زبانوں کا باہمی تعامل کس طرح ثقافتی شناخت اور انفرادیت کے ساتھ قاری کی وابستگی کو گہرا کرتا ہے۔ یہ تکنیک کرداروں کے داخلی کشمکش اور سماجی دباؤ کو دریافت کرنے میں مدد دیتی ہیں، خاص طور پر جب وہ ایک عالمی تناظر میں اپنی روایتی اقدار کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کہانیوں کو مقامی علامات اور علاقائی بولیوں سے آراستہ کر کے، طاہرہ اقبال نہ صرف مؤثر فکشن تخلیق کرتی ہیں بلکہ وہ معاصر ادب میں ثقافتی تنوع کے تحفظ اور اس کی قدر دانی میں بھی بھرپور کردار ادا کرتی ہیں۔

اردو زبان کی ساخت اور لغوی تنوع اس کی ارتقائی تاریخ کا مظہر ہے، جو اسے دنیا کی دیگر مخلوط زبانوں کے ہم پلہ قرار دیتا ہے۔ تحقیق سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان نے اپنے آغاز ہی سے دیگر زبانوں سے الفاظ اخذ کرنے کا عمل جاری رکھا، جو نہ صرف اس کی لسانی وسعت کا ثبوت ہے بلکہ اس کے زندہ اور ترقی پذیر ہونے کی دلیل بھی ہے۔ فارسی، عربی، ترکی، سنسکرت اور بعد ازاں انگریزی سے مستعار لیے گئے الفاظ اردو کے لغوی ذخیرے کو وسیع تر بناتے ہیں۔ یہ الفاظ صرف لغت کی سطح پر شامل نہیں ہوئے بلکہ اردو کے فکری، تہذیبی اور ادبی اظہار یہ کا حصہ بن کر اس کی معنوی ساخت کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ یوں اردو زبان کی موجودہ صورت اس کے تاریخی، جغرافیائی اور سماجی تعاملات کا نتیجہ ہے، جو اسے ایک زندہ، ہمہ گیر اور مخلوط زبان کے طور پر شناخت فراہم کرتی ہے۔

> "اگرچہ دنیا کی دیگر مخلوط زبانوں کی طرح اردو میں بھی کئی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ وہ زبانیں جو مخلوط نہیں ان کا خزانہ بھی مال غیر سے خالی نہیں ہوتا"(۳)

طاہرہ اقبال کی تحریروں میں اردو زبان کے لغوی تنوع اور مخلوط ساخت کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے، جہاں مختلف زبانوں سے مستعار الفاظ نہ صرف اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ثقافتی تصادم اور تہذیبی کشمکش کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ وہ ایسے الفاظ اور تعبیرات کو استعمال میں لاتی ہیں جو قاری کو مختلف تہذیبوں کی باہمی آویزش کا احساس دلاتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریر اردو زبان کی اس ارتقائی شناخت کو اجاگر کرتی ہے جس میں لسانی میل جول، تاریخی اثرات اور سماجی تنوع پوری شدت سے منعکس ہوتا ہے۔

آخر میں، طاہرہ اقبال کے افسانے زبان کے استعمال کے ذریعے ثقافتی تنازعات کی گہرائی سے تحقیق کرتی ہیں۔ ان کا کام نہ

صرف پاکستان کے لسانی اور ثقافتی ورثے کی حفاظت کرتا ہے، بلکہ تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ثقافتی شناخت کی ابھرتی ہوئی تبدیلیوں کے بارے میں بھی اہم بصیرت فراہم کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے افسانے لسانی نمائندگی سے بھرپور ہیں۔ اُن کے افسانے علاقائی بولیوں، مقامی بول چال اور ثقافتی تاثرات کے استعمال کے ذریعے، وہ دیہی اور شہری ماحول میں گہرے سماجی و ثقافتی تناؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔ درج ذیل تجزیہ کا مقصد ان لسانی انتخابات کو ان کے افسانوں میں ثقافتی تصادم کے وسیع موضوعات سے جوڑنا ہے۔ اس ضمن میں ان کے افسانے مِس فٹ سے ایک اقتباس دیکھیئے:

> "وہ ناپ ناپ پکارتی سنار کی دکان کا طواف کرنے لگی۔ چونکہ حقیقتیں اس پر الہام کی طرح منکشف ہوئی تھیں یہ احساس تمام تر شدائد کے ساتھ اس پر برسا کہ اس نے زندگی بناناپ کے گزار دی۔ یعنی مس فٹ، مس میچ، مس فٹ دراصل زندگی ہر گز نہیں ہوتی، محض جبر ہوتا ہے، بے بسی ہوتی ہے، سمجھوتہ ہوتا ہے۔ تین بچے، چودہ برس کی ازدواجی زندگی، مس میچ اور مس فٹ زندگی کے ناگوار نتائج، جیسے سب کچھ محض خواب تھا"(۴)

اس اقتباس کے تناظر میں مس فٹ کی اصطلاح کا تجزیہ کریں تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ذاتی شناخت اور سماجی توقعات کے درمیان اندرونی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے۔ اس حوالے میں، کردار اس احساس کے ساتھ جکڑا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی جو کہ ایک ناکام شادی اور بچوں کے بوجھ سے نشان زد ہے جو اس کے ذاتی خوابوں کی تکمیل کی بجائے ایک سمجھوتے پر مبنی ہے۔ "مس فٹ" کا لسانی انتخاب فرد کی خواہشات اور معاشرتی اصولوں کی طرف سے عائد رکاوٹوں کے درمیان اختلاف کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ اصطلاح روایتی صنفی کرداروں اور خود کے ابھرتے ہوئے احساس کے درمیان گہری ثقافتی کشمکش کو اجاگر کرتی ہے۔

پنجاب کے متنوع ثقافتی تانے بانے میں، ایک منفرد اور گہرا سماجی کردار نسل در نسل محفوظ رہا ہے، اور وہ ہے وِچولن کا کردار۔ وچولن ایک اصطلاح ہے جو پنجابی معاشرے میں سرایت کرتی ہے، اور اس سے مراد وہ عورت ہے جو دو خاندانوں کے درمیان اہم ثالثی کا کردار ادا کرتی ہے، خاص طور پر شادی کے مذاکرات، خاندانی تعلقات، اور سماجی و ثقافتی پیغامات کی منتقلی کے تناظر میں۔ یہ رواج پنجاب کے دیہی ثقافتی تانے بانے میں گہری جڑیں رکھتا ہے اور جدید دور میں بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔

وچولن کا کردار نہ صرف پیغامات کی ترسیل تک محدود ہوتا ہے بلکہ یہ خاندانوں کے درمیان روابط قائم کرنے اور ان کی بنیاد کو مستحکم کرنے کے عمل میں بھی اہم ہے۔ تاریخی طور پر، پنجاب میں طے شدہ شادیاں ایک عام رواج تھیں اور اب بھی کچھ علاقوں میں یہ معمول ہے۔ وچولن وہ شخصیت ہے جو دولہا کے خاندان کے پیغامات، دلچسپیاں، یا خدشات دلہن کے خاندان تک پہنچاتی ہے۔ اس کا کردار نہ صرف ابتدائی تعارف کو آسان بناتا ہے بلکہ دونوں خاندانوں کے درمیان ہر طرح کی بات چیت کی وضاحت اور اس کی تکمیل میں مدد فراہم کرتا ہے۔

وچولن کا کردار محض پیغام رسانی سے بڑھ کر ایک اہم سماجی و ثقافتی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ پنجابی معاشرتی ڈھانچے کا ایک لازمی حصہ ہے، جو روایات، احترام، اور ثقافتی گفت و شنید کی علامت ہے۔ پنجابی معاشرت میں جہاں خاندانی رشتہ داری اور برادری کے تعلقات

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

کی بڑی اہمیت ہے، وچولن ان تعلقات کی تعمیر اور توسیع میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اس کا کردار خاندانی اقدار کو آگے بڑھانے اور کمیونٹی کی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے میں اہم ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر، وچولن کو ایک معزز بزرگ یا قابل اعتماد شخصیت کے طور پر جانا جاتا تھا، جس کا فیصلہ خاندانی تعلقات کے انتظام میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ دیہی علاقوں میں جہاں روابط اور مواصلات زیادہ ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں، وچولن نے اہم سماجی واقعات جیسے کہ شادیوں پر بات چیت کرنے کے لیے ایک اہم چینل کے طور پر کام کیا۔ اس عمل نے خاندانوں کو سماجی حیثیت پر قابو پانے کے مواقع فراہم کیے اور انہیں اپنے معاشرتی اتحادوں کو بہتر طور پر منظم کرنے کی اجازت دی۔ وچولن کا کردار صرف پیغامات کی ترسیل تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ ثقافتی اقدار کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ شادی کے انتظامات کے دوران پیغامات کا تبادلہ ایک گہری ثقافتی نوعیت کا حامل عمل ہے۔ وچولن نہ صرف پیغامات کی ترسیل کو یقینی بناتی ہے، بلکہ وہ ثقافتی روایات، جیسے بزرگوں کی عزت اور خاندانی وقار، کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

جب دولہے کے خاندان کی جانب سے وچولن کا انتخاب کیا جاتا ہے، تو اس کا مقصد نہ صرف بات چیت شروع کرنا ہوتا ہے بلکہ دلہن کے خاندان کے ساتھ پہلی ملاقات میں ایک رسمی حیثیت پیدا کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس کی موجودگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں خاندانوں کے درمیان کوئی اہم فیصلہ یا بات چیت ہو رہی ہے۔ اس کے بعد وچولن دونوں خاندانوں کے درمیان پیغامات کی ترسیل کا عمل جاری رکھتی ہے، اس بات کو یقینی بناتے ہوئے کہ تمام معلومات اور فیصلے بغیر کسی غلط فہمی کے پہنچیں۔ جہاں اس کردار کی ایک ثقافتی اہمیت ہے، وہیں پر اس کردار کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں۔ ان پہلوؤں کو طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے میں اجاگر کیا ہے، ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"گلزاری سنا ہے کہ تو پرے گاؤں کی وچولن ہے۔"

راجہ راز کی کشادہ پیشانی پر بنا جال اُس کے تاثرات کو آنکنے لگا۔

"سارے گاؤں کی نہیں راجہ جی۔ بس نئے نئے جوان ہوئے چھوکرے چھوکریوں کے ٹانکے بھراتی ہے۔"

"پرررر۔۔۔لوگ کہتے ہیں گنڈ' اپنے ہی دھاگے کی لگاتی ہے۔"

"ہٹ پرے آدو' سدا کا وادو' مجھ واڈو"(۵)

اس اقتباس میں طاہر اقبال نے روایتی معاشرتی ڈھانچے میں وچولن کے کردار کی منفی جہت کو نہایت مؤثر انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ راجہ راز اور گلزاری کے مابین مکالمے سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وچولن کی سرگرمیاں محض قابلِ احترام رشتہ کرانے تک محدود نہیں رہیں بلکہ اخلاقی طور پر مشتبہ دائرے تک پھیل گئی ہیں۔ فقرہ "گنڈ" استعاراتی طور پر اس بات کی علامت ہے وچولن اب غیر جانب دار سہولت کار کے بجائے ذاتی مفادات کے تحت رشتوں میں مداخلت اور ہیرا پھیری کر رہی ہے۔ "نوزائیدہ لڑکے اور لڑکیوں" کی شمولیت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ معاشرتی خدمت کے مقدس لبادے میں کمزور طبقات کے استحصال کا عمل جاری ہے۔ اس طرح وچولن ثقافتی اداروں کو ذاتی منفعت کے لیے استعمال کرتے ہوئے سماجی ہم آہنگی کے بجائے معاشرتی انحطاط کا سبب بن رہی ہے۔ طاہر اقبال کی یہ مؤثر تصویر کشی قاری کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اس روایت کے کردار کا تنقیدی جائزہ لے اور یہ سمجھے کہ اگر اخلاقی

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

اقدار کو بر قرار نہ رکھا جائے تو کس طرح وقت کے ساتھ روایتی رسم و رواج بھی بگاڑ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ کردار دیہی رسم و رواج اور شہری حساسیت کے درمیان ثقافتی تصادم کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کہانی کے تناظر میں راجا جی کا کردار ایک شہوانی خواہشات میں گھرا ہوا فرد ہے، جو وچولن کے ساتھ مل کر نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا استحصال کرتا ہے۔ وچولن، جو روایتی پنجابی ثقافت میں شادی بیاہ کے معزز اور قابل احترام معاملات میں سہولت کار کا کردار ادا کرتی تھی، یہاں دلال کے روپ میں سامنے آتی ہے جو ذاتی مفادات اور مالی فوائد کے حصول کے لیے اپنی حیثیت کا غلط استعمال کرتی ہے۔ راجا جی اپنی طاقت اور حیثیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وچولن کے توسط سے کمزور اور ناتجربہ کار نوجوانوں تک رسائی حاصل کرتا ہے، جب کہ وچولن بدلے میں اس استحصالی عمل سے مالی نفع حاصل کرتی ہے۔ اس طرح، کہانی ثقافتی روایت میں موجود ایک معزز پیشے کے زوال کو نمایاں کرتی ہے، جہاں اخلاقی اقدار پس پشت چلی جاتی ہیں اور ذاتی مفادات غالب آجاتے ہیں۔ راوی ایک تہہ دار تنقید کے ذریعے اس بات کو اجاگر کرتا ہے کہ جب سماجی عدم مساوات، طاقت کا ناجائز استعمال اور اخلاقی انحطاط ثقافتی اداروں میں در آتے ہیں تو وہ ادارے اپنی اصل معنویت اور تقدس کھو بیٹھتے ہیں۔ یوں کہانی نہ صرف ایک مخصوص کردار کی اخلاقی پستی کو بے نقاب کرتی ہے بلکہ پورے سماجی ڈھانچے میں موجود خرابیوں کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اس ساری صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"تو دکھا دیتے ہیں راجہ جی دیکھنے کے پیسے تھوری لگتے ہیں۔ پر کوئی نشانی کوئی مندری کا چھلا کوئی نک دا کوکا۔"(۶)

کہانی میں وچولن کا کردار صرف مالی فائدے یا نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے جسمانی استحصال تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ ان سے ذاتی خدمات بھی حاصل کرتی ہے۔ اس طرح وچولن ایک سہولت کار سے بڑھ کر ایک قابض قوت بن جاتی ہے، جو اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے کمزور طبقات سے اپنی ضروریات پوری کراتی ہے۔ یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب ثقافتی اداروں پر اخلاقی زوال چھا جاتا ہے تو وہ استحصال اور خود غرضی کے اڈے بن جاتے ہیں۔

"نکھٹو بے فیضیو کنگلیو وَ! میں سَر پیڑ سے مرے جاتی ہوں۔ اتنی توفیق نہیں کہ دو انڈے لا کر اُبال دو اور دودھ میں پتی ڈال دو۔"(۷)

درج بالا اقتباس میں وچولن کی نوجوانوں کے ساتھ بے تکلفی یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ان کو استعمال کرتی ہے۔ نوجوانوں کا اس سب کے لیے اسے دستیاب ہونا اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اپنی اداؤں سے انہیں لبھاتی ہے جو اس معاشرے یا اس کردار کی اخلاقی گراوٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کردار کے مزاج برہم ہونے پر اس کا نوجوانوں کے ساتھ گفتگو کا انداز ملاحظہ کریں:

"ہٹو پرے دفع ہو جاؤ کیا لینے آتے ہو، جاؤ اپنی ماؤں کے گوڈے سے لگ کر بیٹھو۔"(۸)

اس اقتباس میں وہ نوجوانوں پر طنز بھی کر رہی ہے کہ تم یہاں کیا لینے آتے ہو، تمہاری ابھی عمر ماں کے گوڈے کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کی ہے۔ لسانی اعتبار سے مصنفہ نے ایک ہی لفظ (وچولن) میں پوری ثقافتی حالت کو سمیٹ کر معنی کا ایک نہایت مؤثر اور جامع

اظہار پیش کیا ہے۔ یہ اسلوب قاری کو طویل توضیح کے بغیر معاشرتی حقیقت کی گہرائی تک رسائی فراہم کرتا ہے۔ مصنف کا منتخب کردہ لفظ ایک لسانی علامت کی حیثیت رکھتا ہے، جو مفہوم کی تہہ دار سطحوں، تاریخی سیاق وسباق، اور جذباتی شدت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لفظ محض کسی فرد کے رویے کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ پورے معاشرے کی اقدار، تضادات، اور اخلاقی سمت کی عکاسی کرتا ہے۔ ایسی لسانی اختصار پسندی ادب میں بیانیہ کو محض بیان سے آگے بڑھا کر ثقافتی تنقید کے دائرے میں داخل کر دیتی ہے۔ ایک لفظ پورے سماج کے لیے آئینہ بن جاتا ہے، جو اس کی منافقت، اخلاقی زوال یا ممکنہ تبدیلی کو آشکار کرتا ہے۔ یہ اسلوب اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ تہذیبی جوہر کو نہایت سادہ، مگر پر اثر انداز میں کشید کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتی ہے۔

مقامی ثقافتی تناظر میں واکنگ ٹریک، سٹڈن ڈیتھ، سلیپنگ بیوٹی اور ٹرانسپلانٹیشن جیسے انگریزی تراکیب کا استعمال گلوبلائزیشن سے متاثرہ ایک اہم لسانی و ثقافتی تبدیلی کی علامت ہے۔ یہ تراکیب محض لغوی مسعاریت نہیں بلکہ اس وسیع تر رجحان کی نمائندگی کرتی ہیں جس کے تحت عالمی (بالخصوص مغربی) لغت غیر مغربی معاشروں کی روزمرہ زبان میں سرایت کر چکی ہے۔ انگریزی زبان سے وابستہ علامتی طاقت اور سماجی وقار ان اصطلاحات کو مقامی زبان پر فوقیت عطا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں مقامی اصطلاحات رفتہ رفتہ پس منظر میں چلی جاتی ہیں۔ یہ لسانی ادغام اس عمل کو آشکار کرتا ہے جس کے تحت عالمی ثقافتی اثرات مقامی شناختوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر نئے سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔ تحقیقی تناظر میں، اس نوع کے لسانی شواہد اس امر کو واضح کرتے ہیں کہ انگریزی کس طرح ایک بالادست عالمی زبان کے طور پر ابھری ہے، بالخصوص نو آبادیاتی پس منظر رکھنے والے یا ترقی پذیر معاشروں میں۔ مصنف انگریزی زبان کے استعمال کے ذریعے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ زبان محض ابلاغ کا وسیلہ نہیں، بلکہ جدیدیت، تعلیم، اور سماجی و اقتصادی ترقی کی علامت بن چکی ہے۔ یہی علامتی حیثیت مقامی لسانی و ثقافتی روایات کے بتدریج زوال یا ان کی نئی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ روزمرہ ثقافتی حوالوں میں انگریزی اصطلاحات کی موجودگی درحقیقت عالمی اور مقامی عناصر کے درمیان جاری پیچیدہ اور تہہ دار تعامل کا مظہر ہے، جو اس بات کا متقاضی ہے کہ زبان کے توسط سے وقوع پذیر اس ثقافتی تغیر کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

ان انگریزی اصطلاحات نے مقامی ثقافتی بیانیے میں دخل اندازی کی ہے، جو نہ صرف لسانی مستعاریت کے طور پر بلکہ مقامی اظہار پر عالمی اثر ورسوخ کی مضبوط علامت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

> "کل شام چھ بج کر اڑتالیس منٹ پر جناح پارک کے واکنگ ٹریک پر زبردست دھماکہ ہوا، کئی کلوز نتی تائم بم پھولوں کے کنج میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کئی فٹ گہرے گڑھے بن گئے اور انسانی جسموں کے پرخچے اُڑ گئے۔"(۹)

مصنفہ نے جدید شہری اصطلاحات کا استعمال رکتے ہوئے واکنگ ٹریک پر ہونے والے بم دھماکے کے واقعے کو بیان کیا ہے۔ لسانی اظہار کے ساتھ ساتھ یہ اقتباس پاکستان میں ثقافتی اور سیاسی عدم استحکام کی حقیقت کے درمیاں تصادم کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ واکنگ ٹریک کا استعمال جدید انفراسٹرکچر اور عوامی مقامات سے منسلک انگریزی الفاظ کے استعمال کو اجاگر کرنے کے ساتھ عالمگیریت کے اثرات کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے:

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

"یہ بھی کوئی بات ہے بھلا، نیوز بلیٹن دیکھتے وقت بھی روؤ۔ چلو ہیرو ہیروئن کی ٹریجڈی پر تو رونے کا جواز بنتا ہے لیکن یہ خبریں بھی آج کل کسی ٹریجک فلم کے اینڈ سے کم نہیں ہیں"(۱۰)

درج بالا اقتباس اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ عالمگیریت کے اثرات نے نہ صرف ہمارے طرزِ زندگی کو بلکہ ہمارے جذبات کے اظہار اور روزمرہ تجربات کی ترجمانی کے انداز کو بھی یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔ "نیوز بلیٹن"، "ہیرو" اور "ہیروئن" جیسے الفاظ، جو دراصل انگریزی زبان سے ماخوذ ہیں، اردو سمیت کئی مقامی زبانوں میں روزمرہ گفتگو کا حصہ بن چکے ہیں۔ مقامی تاثرات کے ساتھ انگریزی اصطلاحات کا یہ امتزاج ذرائع ابلاغ کے ذریعے عالمی ثقافت کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی عکاسی کرتا ہے۔ "نیوز بلیٹن دیکھتے ہوئے رونا" اور اس کیفیت کا ایک "افسوسناک فلم" کے جذباتی اختتام سے موازنہ کرنا اس بات کا مظہر ہے کہ عالمی سینما اور میڈیا کی زبان نے جذبات، غم اور بیانیہ کی مقامی تفہیم کو نئی صورت دے دی ہے۔ جو جذبات کبھی روایتی استعاروں یا ثقافتی محاوروں کے ذریعے بیان کیے جاتے تھے، اب انہیں مغربی زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور پیش کیا جارہا ہے۔ زبان کا یہ بدلتا ہوا استعمال ایک گہری ثقافتی تبدیلی کی نشان دہی کرتا ہے۔ یعنی بین الاقوامی فریم ورک میں مقامی تہذیبی حساسیت کا ضم ہو جانا۔ جیسے جیسے انگریزی اصطلاحات ہماری روزمرہ زبان میں رائج ہو رہی ہیں، ویسے ویسے مقامی ثقافتی علامتیں یا تو بدل رہی ہیں یا مٹتی جارہی ہیں۔ اب غم یا المیے کے اظہار کے لیے مقامی ادبی حوالوں کے بجائے، لوگ عالمی استعاروں جیسے "ہیرو" اور "افسوسناک فلم" پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ یہ تبدیلی مقامی اور عالمی ثقافتوں کے درمیان مسلسل تصادم کو ظاہر کرتی ہے، جہاں ایک معاشرے کے جذباتی اظہار کی زبان آہستہ آہستہ نئے مفاہیم اختیار کر رہی ہے۔ عالمگیریت بلاشبہ رابطے کے ذرائع کو فروغ دیتی ہے اور ثقافتی افق کو وسعت دیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ مقامی تہذیبی شناختیں ایک مشترک عالمی ثقافت میں مدغم ہو جائیں۔ یوں، یہ اقتباس نہ صرف زبان کے بدلتے ہوئے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کے پس منظر میں جاری ثقافتی اور جذباتی تبدیلیوں کا آئینہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"دل، جگر، گردے کچھ بھی باغی سا بدن سے نکال دینے کی صورت میں ٹرانسپلانٹیشن ضروری ہوتی ہے۔ یعنی ایسا ہی ایک عضو پہلے کی جگہ پر لگنا چاہیے، ورنہ موت۔۔۔۔ اور جب جلد اور ہڈیوں کے اندر کسی باغی اعضاء کی پلانٹیشن ممکن نہ رہے، تو پھر اُسی بیمار عضو کے ساتھ ہی جینا ہوتا ہے۔"(۱۱)

"ٹرانسپلانٹیشن" اور "پلانٹیشن" جیسے الفاظ، جو انگریزی زبان سے ماخوذ ہیں، اب غیر انگریزی بولنے والے معاشروں میں بھی مستعمل اور معیاری اصطلاحات بن چکے ہیں۔ یہ امر طب کے شعبے میں عالمگیریت کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح کی اصطلاحات کا روزمرہ زبان میں شامل ہو جانا اس بات کی علامت ہے کہ سائنسی تحقیق، عالمی طبی مواصلات اور تعلیمی تبادلوں نے طبی علم، طریقۂ علاج اور زبان کو سرحدوں سے آزاد کر دیا ہے۔ اعضاء کی پیوند کاری جیسے تصورات، جو کبھی صرف ترقی یافتہ ممالک تک محدود تھے، اب دنیا بھر میں نہ صرف جانے پہچانے جاتے ہیں بلکہ ان پر عمل بھی کیا جارہا ہے اور ساتھ ہی وہ مخصوص زبان اور فکری پس منظر بھی اپنا اثر دکھا رہا ہے جس سے یہ تصورات جنم لیتے ہیں۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو عالمگیریت نے نہ صرف جدید طبی ٹیکنالوجی تک رسائی کو آسان بنایا ہے بلکہ انسانی جسم، صحت اور بیماری کے بارے میں اظہار کے طریقوں کو بھی نئی جہت دی ہے۔ لفظ "ٹرانسپلانٹیشن" صرف ایک طبی عمل کی نشاندہی نہیں کرتا، بلکہ یہ ایک ایسے عالمی طبی نظریے کا حصہ ہے جو جدید سائنس اور بین الاقوامی نظامِ صحت کی سوچ سے تشکیل پایا ہے۔ جب اس نوعیت کی اصطلاحات مقامی زبانوں کا حصہ بنتی ہیں، تو یہ صرف لسانی تبدیلی نہیں ہوتی، بلکہ یہ ایک گہری ثقافتی تبدیلی کا اظہار بھی ہوتی ہے۔ جہاں جسم اور شفا کے بارے میں روایتی تصورات یا تو جدید سائنسی بیانیے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں یا رفتہ رفتہ ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یوں یہ اقتباس اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ عالمی اثرات اب ہماری زندگی، صحت اور بقا کے فہم میں کس طرح گہرائی سے پیوست ہو چکے ہیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں یہ امر واضح ہے کہ کس طرح زبان عصرِ حاضر کی دنیا میں ثقافتی تصادم کو اجاگر کرتی ہے۔ کن ٹٹہ، ہٹ پرے، گھم گھم مدھانی، ٹرانسپلانٹیشن، سلیپنگ بیوٹی، سڈن ڈیتھ جیسے الفاظ کا استعمال مقامی اور عالمی ثقافتوں کا باہمی ملاپ کہانیوں کے مواد میں بلہ اس کے لسانی پیرائے میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ ان کے افسانوں میں مقامی اور انگریزی الفاظ کا شعوری استعمال مقامی ثقافت اور عالمگیریت کے درمیان پائے جانے والے تناؤ کو نمایاں کرتا ہے، جو سماجی و سیاسی تبدیلی کے پس منظر میں تشکیل پاتی مابعد نو آبادیاتی شناخت کا عکاس ہے۔

اس لسانی طرزِ اظہار سے ہمیں روایت، جدیدیت اور عالمگیریت کے درمیان ایک ثقافتی کشمکش نظر آتی ہے۔ انگریزی اصطلاحات جیسے Transplantation، Sleeping Beauty، Sudden Death اور دیگر روزمرہ کے الفاظ محض زبان کی سطح پر مستعار الفاظ نہیں، بلکہ ان کے ساتھ مغربی تصورات، استعارے اور بیانیے بھی در آتے ہیں۔ یہ الفاظ علمی، سائنسی اور میڈیا کے عالمی تناظر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ اس کے بالمقابل کن ٹٹہ، ہٹ پرے، گھم گھم مدھانی جیسے الفاظ مقامی ثقافت، محاورے، اور دیہی معاشرت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ الفاظ عوامی روایات اور مقامی شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مصنفہ کے ہاں دونوں لسانی دنیاؤں کی موجودگی ایک داخلی ثقافتی تضاد کو جنم دیتی ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں زبان کا بدلتا ہوا مزاج اور اس میں ہائبرڈ (hybrid) عناصر کا استعمال محض فنی تکنیک نہیں بلکہ ایک سوچا سمجھا عمل ہے، جو اس ثقافتی کشمکش کی نمائندگی کرتا ہے۔ جب کسی دیہی یا جذباتی ماحول میں Transplantation جیسے سائنسی لفظ کا استعمال ہوتا ہے، تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی جدیدیت مقامی سماج میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ بعض اوقات یہ الفاظ غیر فطری انداز میں کہانی میں داخل ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی یہ موجودہ اقدار و نظریات کی جگہ لے لیتے ہیں۔ Sleeping Beauty اور Sudden Death جیسے عنوانات محض واقعات یا کرداروں کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ وہ ایک وسیع تر تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو کہانی کے ثقافتی بیانیے کو متاثر کرتی ہے۔

اس کے علاوہ، ان افسانوں میں پایا جانے والا لغوی تناؤ ایک وسیع سماجی حقیقت کی بھی عکاسی کرتا ہے، جہاں شہری اور اشرافیہ طبقات تیزی سے عالمی زبان اور ثقافت کو اپناتے ہیں، جبکہ دیہی یا محروم طبقے اپنی مادری زبان اور روایتی شناخت سے وابستہ رہتے

ہیں۔ یہ لسانی تفریق ثقافتی اور شناختی بحران کو جنم دیتی ہے، جسے طاہرہ اقبال نہایت مہارت سے کہانیوں کے ذریعے پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں اس بات کا اظہار بن جاتی ہیں کہ زبان صرف رابطے کا ذریعہ نہیں بلکہ شناخت اور ثقافت کا مظہر بھی ہے۔

نتیجتاً، طاہرہ اقبال کے افسانوں میں انگریزی اور مقامی زبان کا امتزاج ایک بامعنی ادبی عمل ہے، جو مقامی اور عالمی ثقافتوں کے درمیان جاری کشمکش کو زبان کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ ان کے الفاظ، بیانیہ تکنیک، اور زبان کی تبدیلی محض فنی انتخاب نہیں بلکہ بین الثقافتی تبدیلی کے اثرات کی ادبی نمائندگی ہیں۔ ان کی کہانیاں اس جدوجہد کا آئینہ ہیں جو شناخت، زبان اور معنی کی سطح پر ایک بدلتی ہوئی دنیا میں جاری ہے، اور یہی پہلو انہیں بین الثقافتی ادب میں ایک نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں میں لسانی تصادم محض اسلوبیاتی یا موضوعاتی انتخاب نہیں بلکہ روایت اور جدیدیت کے مابین جاری تعامل سے جنم لینے والے ایک گہرے ثقافتی رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ ان کے ہاں شعوری طور پر ہائبرڈ الفاظ کا استعمال یعنی انگریزی سائنسی اور میڈیا سے ماخوذ اصطلاحات کو مقامی محاوروں اور تاثرات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا، عصری پاکستانی معاشرے میں ابھرتے ہوئے لسانی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ لسانی امتزاج ایک بیانیہ تناؤ پیدا کرتا ہے جو مقامی ثقافتی اقدار اور عالمی اثرات کے درمیان محصور کرداروں کے اندرونی ثقافتی مخمصوں کو اجاگر کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں کی زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مکالماتی میدان ہے، جہاں مختلف عالمی نظریات ایک دوسرے سے متصادم ہوتے، گاہے باہم مدغم ہوتے ہیں، اور مابعد نو آبادیاتی و عالمی ثقافتوں کے وسیع تر سماجی و لسانی تناظر کی عکاسی کرتے ہیں۔

تحقیقی نقطۂ نظر سے ان افسانوں کا تجزیہ ادبی تشریحی اور سماجی لسانی طریقہ کار کے امتزاج کے ساتھ مؤثر طور پر ممکن ہے۔ قریبی متنی مطالعہ، موضوعاتی تجزیہ اور گفتگو کی تعبیر و تشریح کے ذریعے ان کہانیوں میں زبان کے انتخاب کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ یہ انتخاب کس طرح شناخت کی تشکیل، ثقافتی ربط اور مزاحمت کی صورتیں پیش کرتا ہے۔ معیاری تحقیقی طریقہ کار کے ذریعے اس امر کی تفہیم کی گئی ہے کہ کس طرح زبان کے ذریعے معنی خلق کیے جاتے ہیں اور لسانی تغیرات کے ردِ عمل میں ثقافتی بیانیے وجود میں آتے ہیں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ Ahmed, Toqeer. "A Saga of Bilingualism and Belonging: An Analysis of Language Use and Hybrid Identity in The Reluctant Fundamentalist." Pakistan Languages and Humanities Review, vol. 8, no. 2(Special Issue), 2024, p.534–542

۲۔ عبد الستار ملک، ڈاکٹر، مضمون: سماجی لسانیات ایک تعارف،، متن، جلد ۴، شمارہ ۲

۳۔ عصمت جاوید، ڈاکٹر، اُردو پر فارسی کے لسانی اثرات۔ تصرف کے آئینے میں، مہاراشٹر پرنٹنگ اسکول، سوا شیو پیٹھ۔ پونا

۴۔ طاہرہ اقبال، مس فٹ (ریخت)، دوست پبلیکیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵۵

۵۔ طاہرہ اقبال، وچولن (ریخت)، دوست پبلیکیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴۱

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۷۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۴۳

۹۔ طاہرہ اقبال، واکنگ ٹریک (ریختہ) دوست پبلیکیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۵

۱۰۔ طاہرہ اقبال، سلیپنگ بیوٹی، (گنجی بار) ورڈ میٹ، اسلام آباد، ص ۲۶۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۳۶

References in Roman Script:

1. Ahmed, Toqeer. "A Saga of Bilingualism and Belonging: An Analysis of Language Use and Hybrid Identity in *The Reluctant Fundamentalist*." *Pakistan Languages and Humanities Review*, vol. 8, no. 2 (Special Issue), 2024, p.534–542.
2. Malik, Abdul Sattar, Dr. "Samaji Lisaniyat: Aik Taaruf." *Matn*, jild 4, shumara 2, 2024, ss. xx–xx.
3. Ismat Javed, Dr, Urdu par Farsi ke lisani asraat: Tasarruf ke aaine mein, Maharashtra Printing School, Swa Shivpeeth, Puna
4. Tahira Iqbal, Misfit (Rekht), Dost Publication, Islamabad, 2010, p.55
5. Tahira Iqbal, Vacholan (Rekht), Dost Publication, Islamabad, 2010, p.141
6. Ibid, p.143
7. Ibid, p.143
8. Ibid, p.143
9. Tahira Iqbal, Walking Track (Rekht), Dost Publication, Islamabad, 2010, p.155
10. Tahira Iqbal, Sleeping Beauty, (Ganji Baar), Word Mate, Islamabad, p.264
11. Ibid, p.236

Dr. Ghazal Yaqub is a Teaching Research Associate in the Urdu Department at International Islamic University, Islamabad, Pakistan. She completed her PhD at IIU Islamabad, specializing in Urdu fiction and prose. Dr.Ghazal has authored one book and published seventeen articles. She was awarded a Gold Medal in her BS program and received the “Faiza Ahmed Faiz Award” for her book.

Dr. Muhammad Amjad earned his PhD in Urdu from the National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan, with a focus on Urdu linguistics. He has published six articles.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

Received: 15th Feb, 2025 | Accepted: 11th June, 2025 | Available Online: 30th June, 2025
Digital Object Identifier: 10.52015/daryaft.v17i01.414

اکیسویں صدی کے امریکی اسفار پر مبنی سفر ناموں کا سیاسی اور سماجی جائزہ

The Political and Social Analysis of Travelogues based on American Travels in the 21st Century

NAYAB TAHIR
PhD Research Scholar, Department of Urdu, University of Education, Lower Mall Campus, Lahore, Pakistan.
(nayaburdu@gmail.com)

ABSTRACT A travelogue is a unique literary form in which an author documents a journey while offering detailed observations of both external landscapes and internal reflections. Traditionally, travelogues focused on geographic descriptions and cultural details, but modern travel narratives have evolved to explore politics, society, economy, and cultural shifts through a research-driven approach. In the 21st century, American travelogues have become more diverse in themes and styles, providing insightful and thought-provoking literary experiences. These works go beyond tourism, delving into issues such as immigration policies, racial discrimination, white supremacy, migration, cultural evolution, foreign policy, terrorism, geopolitical tensions, and media influence on public opinion. Despite highlighting challenges, travel writers also appreciate America's strengths, including punctuality, lawfulness, cleanliness, discipline, personal freedom, and the protection of human and animal rights. These virtues have contributed to America's global influence. Ultimately, American travelogues serve as a window into the nation's complexities, helping readers critically analyze its societal and political landscape while also recognizing its positive aspects.

Keywords Travelogues, Political, Social, Sociopolitical, American, Discrimination.

انکشافِ ذات اور کائنات کی دریافت دونوں کے لیے سفر ایک بہترین وسیلہ ہے۔ سفر نامہ ایسی نثری صنفِ ادب ہے جس میں کوئی مصنف، کسی مخصوص علاقے یا ملک کا سفر کرتا ہے تو اپنے خارج اور داخل کی دنیا کا مطالعہ ومشاہدہ پیش کرتا ہے۔ جدید سفر نامے محض سیر وسیاحت یا جغرافیہ کی معلومات کے بجائے سیاست، ثقافت، معاشرت اور معیشت سے متعلق تحقیق پر مبنی فن پارے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق سفر نامہ کی تعریف کچھ یوں ہے کہ:

> "سفر نامہ سفر کے تاثرات، حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو سفر نامہ نگار سفر کے دوران یا اختتامِ سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔ اس صنفِ ادب کا تمام تر مواد موجود منظر کے گرد وپیش میں بکھرا ہوتا ہے۔"(۱)

This work is licensed under a Creative Commons Attribution-NonCommercial 4.0 International License (CC BY-NC 4.0)

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

ایک صاحبِ نظر جب کسی ملک کی روداد تحریر کرتا ہے تو وہ اسکی معاشرت اور طرزِ حیات کے تمام زاویوں کو پیش کرتا ہے، اس حوالے سے "سماج" اور "سیاست" دو اہم زاویے ہیں۔ سماج انسانوں کے اس بڑے گروہ کو کہتے ہیں جو آپس کے باہمی میل جول کے اعتبار سے مخصوص رسم و رواج، اور اَقدارِ حیات کا حامل ہو۔ اِسی طرح سیاست عوام کے اُمور کی اصلاح، مُلک کے کاموں کی تدبیر، مُلک کے داخلی اور خارجی اُمور کی نگرانی کو کہتے ہیں۔ نئی صدی میں مختلف مُلکوں کے سیاسی منظر نامے پر بہت تیزی سے تبدیلیاں آئی ہیں جس نے عالمی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اسی طرح مختلف مُلکوں کے سماجی نظام پر بھی تبدیلیوں کے نُقوش ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں مگر اس کے باوجود مختلف سماجوں کی انفرادی شناخت قائم ہے۔ امریکہ عالمی منظر ناموں کے حوالے سے اہم ملک ہے، جس کی سیاست اور سماج بین الاقوامی سطح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس تحریر میں اکیسویں صدی کے چار مختلف امریکی سفر ناموں میں پیش کردہ سیاسی و سماجی تصوّرات کا جائزہ لیا جائے گا کہ یہ سفر نامے امریکی زندگی سمجھنے میں مدد و معاون ہیں۔

فاروق عادل کے سفر نامے "ایک آنکھ میں امریکہ" میں واقعات کے ادبی اسلوب پر مبنی بیانیے نے اسے معلوماتی خزینے سے بڑھ کر مقام عطا کیا۔ فاروق عادل سمیت صحافیوں کا گروہ جب اسٹڈی ٹور پر امریکا پہنچا تو ان کی سیاحت کو ضیاء شاہد نے "اندر کا سفر" قرار دیا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے ان کے سفر نامہ پر تبصرہ کیا کہ:

> "ان کے سفر نامے سے امریکی زندگی، اس کی تہذیب و معاشرت، سیاست و تمدن کے بارے میں ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔"(۲)

ابراہم لنکن کا مجسمہ دیکھتے ہوئے مصنف نے اپنے سماجی شعور کی بنا پر سرکاری املاک اور عوامی جگہوں سے متعلق امریکی عوام کے اجتماعی رویے کو سراہا کہ کس طرح وہ یادگاریں بناتے اور محفوظ رکھتے ہیں۔ امریکن سسٹم "اپنی جیب اپنا کھانا" اب پاکستان میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ مصنف کو کوئی ایسا آفس یا کلرک نہ ملا جس کے پاس سفارشی خطوط کے انبار لگے ہوں۔ امریکہ کو اس مقام تک پہنچنے کے لیے عوام کی کرپشن فری سرکاری نوکریوں کے انقلاب سے گزرنا پڑا تھا۔ وہاں ایوان کے تالے کھولنے کے لیے کسی سپیکر کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ وہاں کے ایک سینیٹر نے مصنف کو بتایا کہ:

> " گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے ایک ٹرک خریدا ہوا ہے جس سے وہ بار برداری کا کام لیتا ہے مگر ذاتی استعمال کی، گھر کے لیے کوئی گاڑی بھی نہیں ہے اور پورا خاندان پبلک ٹرانسپورٹ کا استعمال کرتا ہے۔"(۳)

مصنف کے مطابق امریکہ اپنے مفادات و مقاصد کے پیشِ نظر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کر دیتا ہے۔ جیسے صدر بش نے عراق جنگ کی تمام تر ذمہ داری سی۔ آئی۔ اے کی غلط رپورٹنگ پر ڈال دی جس کی بنا پر امریکہ بقاء کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسلحہ تلاش اور تلف کرنے عراق پر حملہ آور ہوا۔ مصنف فقیروں کی بابت بتاتے ہیں کہ اس سماج میں بھی زبردستی خیر وصول کرنے والے فقیر ہیں، جن کو اگر خیرات نہ دو تو جان دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ واشنگٹن کے نواح میں بغیر چار دیواری منگتوں کے گھر تھے جن کی ضروریات یا تو کچرے کے ڈھیر سے یا پھر مانگ تانگ کر پوری ہوتی ہیں۔

مصنف نے "ویتنام میموریل" میں جب کسی کو پھولوں سمیت دیکھا تو اسے امریکہ کے خاندانی نظام کی باقیات کا ثبوت گردانا۔ افغانستان سے فوجیوں کے آئے لاشوں سے دلبرداشتہ عوام نے حکومت سے جنگ بندی چاہی تو امریکی جنگی پالیسی ہی بدل گئی کہ کم سے کم فوجی ہلاکتیں ہوں اور عوام کا کم سے کم احتجاج ہو۔ امریکی ماہرینِ دفاع سے تبادلہ خیال سے مصنف کو اندازہ ہوا کہ وہ افغانی طالبان کو اپنا حریف سمجھتے ہوئے اسامہ بن لادن کو مارنے کے خواہش مند تھے۔ پاکستانی صحافیوں نے جب میزبانوں سے کشمیر پر گفتگو کرنا چاہی تو انھوں نے صرف مسئلہ افغانستان پر ہی بات کی۔ مصنف سمجھتے ہیں کہ امریکہ صرف اپنی بالادستی کا خواہاں ہے اور اپنے ہدف کو بہر طور حاصل کر لیتا ہے۔ جس طرح روس اور چین نے امریکہ ویتنام آگ بھڑکائی تھی اسی طرح امریکہ نے افغانستان کو روس کے مدمقابل کر کے اسے روس کا ویتنام بنا دیا۔

مصنف نے جب اداریہ نویسوں کے سامنے اعتراض رکھا کہ امریکہ نے ایف سولہ طیاروں کے معاہدے میں ادائیگی کے باوجود پاکستان کو طیارے بھی فراہم نہ کئے اور رقم بھی واپس نہ دی تو ایک امریکی اداریہ نویس نے اپنی ڈائری پر نوٹ کرنا شروع کیا جیسے وہ اس سے بے خبر ہو۔ واشنگٹن کے صحافی یہودی لابی کے زیر سایہ پاکستانی ایٹمی اثاثوں کے خلاف اخبارات میں مضامین شائع کرتے اور کرواتے ہیں۔ گویا مصنف کے مشاہدے میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ:

"امریکہ میں صحافت کی غیر جانبداری کا تصور بس تصور ہی ہے۔"(۴)

امریکی اخبارات میں پروپیگنڈے سے یہودی، رائے عامہ اپنے حق میں ہموار کرتے ہیں لیکن عوام حق بات میں اپنی حکومتوں کے سامنے بھی ڈٹ جانے والی ہے۔ مصنف کی ملاقات وہاں ایک "پروفیشنل پروٹیسٹر" سے ہوئی جو عالمی سطح کی زیادتیوں کے خلاف مظاہرین میں شامل تھی۔ ان دنوں وہ فلسطین کے حق میں احتجاج کر رہی تھی، جبکہ امریکی اخبارات میں تصویروں کے ساتھ خبریں کچھ یوں تھیں کہ:

"یہ معصوم بچہ فلسطینیوں کی بے رحمانہ گولہ باری سے زخمی ہوا۔۔۔ ہر روز کتنے ہی بچے ہوتے ہیں
جو اس طرح فلسطینیوں کی انسانیت دشمن کارروائیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔"(۵)

خود پسندی کے احساس میں مبتلا امریکہ دنیا کے مقابل نہیں آتا، بلکہ اپنی ہی باون ریاستوں کے مابین مقابلے کرواتا ہے۔ مصنف کی جب ایک عام امریکی شہری سے ملاقات ہوئی تو اس نے پاکستانی سیاست کی بے اصولی، ذاتیات اور دھاندلی پر کئی سوالات اٹھائے۔ مصنف کی سیاسی بصیرت نے یہ باور کروایا کہ اس بات کی ذمہ دار کافی حد تک امریکی حکومت ہے۔ امریکہ میں بھی جب صدارتی انتخابات میں بُش ہار گیا تھا تو عدالت نے اسے کامیاب قرار دے دیا۔ اب امریکی سیاستدان بھی ایک دوسرے کی ذاتیات پر حملہ آور ہوتے ہیں مثلاً بُش سینئر کی پہلی انتخابی مہم میں اس کے مخالف امیدوار نے تقریر میں کہا کہ:

"اس سے زیادہ خارجہ پالیسی تو میرا کتا جانتا ہے۔"(۶)

امریکہ کی ترقی کا سامان جابجا دِکھتا ہے لیکن یہ ایسی قوم ہے جو باوجود ترقی کے تیرہ کے ہندسے سے خوف کھاتی ہے۔ قانون کی بالادستی اور صفائی کی خوبی ایسی کہ تمام خامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے کافی ہو۔ ایک عام شہری کے لیے بھی بہترین ایمبولینس فوراً ہسپتال

پہنچانے آجاتی ہے جبکہ پاکستان میں تو ایسی سہولت بانی پاکستان کو بھی میسر نہ تھی۔ ایسی باتوں کے موازنے پر مصنف کو شرمندگی محسوس ہوئی۔ آزادانہ جنسی فعالیت اس معاشرے کی عام پہچان ہے۔ خواتین کا برائے نام لباس، مرد و زن کا اختلاط اور جوڑوں کا ہر جگہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہونا یہاں کی زندگی کے معمولات ہیں۔ مصنوعی ذہانت والی گڑیاؤں نے آدمی کو صحبت دے کر عورت سے بیگانہ کر دیا ہے۔

فاروق عادل نہ تو امریکہ سے مرعوب نظر آتے ہیں اور نہ ہی متنفر۔ جہاں اس قوم کی خوبیوں کو تسلیم کرتے ہیں وہیں ان کی کج فہمیوں، دہرے معیار زندگی اور مادیت پرستی کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ جہاں مصنف نے امریکی عوام کے شعور کی بات کی، ان کی انسانی ہمدردی کو سراہا وہیں ان کی توہم پرستی کی طرف بھی اشارہ کر دیا۔ جہاں مصنف نے ان کے تاریخی عظیم واقعات و شخصیات کو یاد رکھنے کا ذکر کیا وہیں ایٹمی تباہی کو فراموش کر کے خود ساختہ جنگوں میں کودنے کی بھی بات کی۔ مصنف کا سیاسی و سماجی شعور حقائق پر مبنی سفر نامے کی تکمیل میں مددگار ثابت ہوا، جس کی بدولت ان کی ادبی حیثیت کو وقت کے دانشوروں نے بھی سراہا۔ بقول جاوید چودھری:

> "میں نے فاروق عادل کا یہ سفر نامہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ شہرت کی دیوی میرے سمیت اس ملک کے بے شمار رائٹرز، کالم نگاروں اور مصنفوں کے آستانے سے اٹھ کر فاروق عادل کی طرف بڑھ رہی ہے اور اگر یہ ایک بار اس کے قابو میں آگئی تو پھر پٹھان کی بیوی کی طرح کوئی مصنف اس کی شکل نہیں دیکھ سکے گا۔"(۷)

رضاء الحق صدیقی کا سفر نامہ "دیکھا تیرا امریکہ" ایسے مسافر کی داستان ہے جو فطری حسن سے حظ اٹھاتے ہوئے انسانی کارگزاریوں اور انتظامی امور کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ صحافت سے تعلق نے ان کی تحریر کو تاثیر اور سادگی بخشی۔ وہ اپنے احساسات و تجربات سے قارئین کے تجسس کو ابھارتے ہوئے ادبی ذوق کی تسکین کر جاتے ہیں۔ تیسری دنیا کے لوگوں کے لیے، ترقی یافتہ ممالک کے قوانین ایسے عجیب ہیں کہ امریکی امیگریشن افسر بلا جواز کسی پر بھی امریکہ داخلے پر پابندی لگا سکتا ہے۔ امریکی جغرافیہ پر صدیقی صاحب کا تبصرہ کچھ یوں تھا کہ میری لینڈ، واشنگٹن اور ورجینیا، راولپنڈی اسلام آباد کے مانند جڑواں ریاستیں ہیں۔ امریکہ میں حلال سٹورز ڈھونڈنا اور ان تک جانا ناممکن نہیں پر مشکل ضرور ہے۔ وہاں کے سرمایہ دارانہ نظام میں مذہب اور اس کے تہوار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مصنف کو مسجد اور اذان کے بغیر وہاں رمضان کا آخری ہفتہ اور روزِ عید بڑا بے رونق سا لگا۔ مصنف نمازِ عید پڑھنے مسلم کمیونٹی سینٹر پہنچے تو انہیں لگا کہ جیسے مسلمان کوئی پکنک منانے آئے ہوں۔ بقول مصنف:

> "مرد عورتیں بچے سبھی وہاں تھے، زیادہ تر لوگ مغربی لباس میں ہی تھے لیکن بہت سی فیملیز پاکستان کے قومی لباس میں بھی تھیں جن میں ہم بھی شامل تھے۔ آٹھ دس دن کے بعد شلوار کُرتے میں امریکہ میں پھرنا اچھا لگ رہا تھا۔"(۸)

وقت کی پابندی اور نظم و ضبط اس سماج کا خاصہ ہے۔ گاڑیاں بے شمار ہیں لیکن مجال ہے جو ہارن کی بے جا آوازیں ہوں یا گاڑی اپنی مخصوص جگہ سے ہٹ کر پارک ہو۔ مصنف صفائی ستھرائی کا اہتمام اور قانون کا احترام کرنے والی پودوں پارکوں کی شوقین قوم سے متاثر ہوئے۔ ان کے مطابق:

"یہ نیچر سے پیار کرنے والی قوم ہے۔ یہاں ہر طرف ہریالی بکھری ہے۔ درختوں کی بہتات ہے۔ ہر طرف گھنے جنگل نما پارک ہیں۔"(۹)

منٹگمری کاؤنٹی میں موجود "بروک سائیڈ بوٹینیکل پارک" کے میموریل پتھروں پر دہشت گردی کا شکار ہونے والے دس معصوم افراد کے نام کندہ تھے گویا اول درجے کا ملک بھی اس لعنت سے محفوظ نہیں۔ باربردار اور مسافر بردار طیاروں سے ہوتے ہوئے بات جب ڈرون تک پہنچتی ہے تو اس کی بنیاد رائیٹ برادران کا جہاز ہی تھا۔ مصنف کی سیاسی بصیرت اس بات کی گواہ ہے کہ صدر بش اور اوباما کے دور میں پاکستان میں ڈرون حملوں میں اضافہ ہوا۔ امریکی سماج میں جس قسم کی موسیقی اور بینڈز پسند کیے جاتے ہیں معمر اور باذوق افراد تو اسے شور شرابا ہی کہتے ہیں۔ پاکستانی نوجوان بھی اب اس قسم کی موسیقی اور سیلفی کلچر کے دلدادہ ہیں۔ یہاں عوامی مقامات پر نوجوان لڑکیاں رقص کا مظاہرہ کرتی ہیں تو سکّوں اور ڈالروں کی بارش ہو جاتی ہے۔

مصنف دریائے پوٹامک کی جغرافیائی صورتحال کی بدولت اسے انواع واقسام تہذیبوں کا حامل ٹھہراتا ہے۔ ایک طرف کوئلہ کے کان کن تو دوسری طرف شہری علاقے، ایک طرف دارالخلافہ کے رہائشی تو دوسری طرف مچھیروں کی ثقافت ہے۔ یہ قوم کتوں کے ساتھ خصوصی التفات رکھتی ہے، جن کی حیثیت، حقوق اور سہولیات تیسری دنیا کے انسانوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ امریکی عوام کام کے دنوں میں ڈٹ کر کام کرتے ہیں اور پھر ویک اینڈ پر تفریح کرتے ہوئے بچت بالکل بھی نہیں کرتے۔ مصنف کے خیال میں اگر اس معاشرت میں ایک بچہ تیرہ سال کے بعد والدین کی ذمہ داری نہیں رہتا ہے تو بڑھاپے میں بچے بھی والدین کو اولڈ ہوم بھجوا دیتے ہیں۔ امریکہ میں طلاقیں میاں بیوی میں سے کسی ایک کے آوارہ یا بانجھ پن کے سبب ہوتی ہیں۔

مصنف نے سمندری جزیرے پر کھڑے مجسمۂ آزادی کو دیکھا جسے ۱۹۲۴ء میں قومی یادگار بنایا گیا۔ اس مجسمہ کے سر پر تاج اور چغے سے نکلے دائیں ہاتھ میں مشعل اور بائیں میں کتاب ہے جس پر امریکہ کی تاریخِ آزادی کندہ ہے۔ اس کے پیروں کی ٹوٹی زنجیریں ظلم اور جھوٹ کے خاتمے کی علامت ہیں۔ مصنف امریکہ فرانس تعلقات پر سیاسی تبصرہ کرتے ہیں کہ:

"یہ مجسمہ ساز فیڈرک آگسٹی برتھولڈی کا سوچا ہوا خیال، فرانس کی طرف سے دوستی کا تحفہ اور دو قوموں کے درمیان آزادی کے لیے کمٹمنٹ کا نشان ہے۔"(۱۰)

امریکہ کے ایلس آئی لینڈ جزیرہ کو "گیٹ وے ٹو امریکہ" بھی کہا جاتا ہے جہاں تارکینِ وطن کی کشتیاں لنگر انداز ہوتی تھیں۔ امریکی قوم اور حکمران اپنے قدرتی حسن اور انسانی تعمیرات کو سنبھالنے میں ماہر ہیں کہ یہی ان کا کُل اثاثہ ہے۔ مصنف اپنی سماجی اور سیاسی بصیرت پر مبنی رائے دیتے ہیں کہ:

"امریکہ اک نئی دنیا ہے جس کے پاس کوئی ماضی نہیں، صرف حال ہے اور اسی حال میں جو کچھ اس کے پاس ہے، امریکیوں کو اسی کو سنبھالنا ہے۔"(۱۱)

مصنف القاعدہ کے دو طیارے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے اور ایک طیارے کو پینٹاگون پر گرانے پر ہزاروں بے گناہ افراد کی موت پر افسوس کرتے ہیں۔ جگہ چاہے ورلڈ ٹریڈ سنٹر ہو یا ہیروشیما، ناگاساکی یا افغانستان اور اعراق، معصوم انسانیت ظلم کا شکار ہے۔

اس حادثہ پر امریکی قوم کا ردعمل کچھ یوں تھا کہ:

"وہ اس سانحہ سے اپنی جگ ہنسائی نہیں چاہتی، جتنا ماتم انھوں نے کرنا تھا وہ کر لیا اب وہ ماتم کروانے کے درپہ ہے۔ اس تباہ شدہ حصے پر اب امریکی نہیں آتے صرف سیاح آتے ہیں۔"(۱۲)

امریکی سماج پر گہری نظر ڈالتے ہوئے مصنف اپنے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں کہ امریکی قانون کے مطابق ہر ایک کو شخصی آزادی حاصل ہے۔ حکومت کو اختیار نہیں کہ وہ عوام کی ذاتی زندگی پر اپنے فیصلے مسلط کرے۔ اس روش کی حد ہم جنس پرستی کو قانونی قرار دینا ہے۔ مصنف نے مین ہاٹن میں کالوں کی بستی، ہارلیم دیکھی جہاں ہالینڈ کے باشندے آکر آباد ہوئے تھے۔ وہاں جابجا کوڑے کے ڈھیر میں میلے کچیلے لوگ تیسری دنیا کے باشندے لگ رہے تھے۔ مصنف ان افراد پر سماجی اور معاشرتی تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"یہاں رہنے والے کالے، زندگی سے بیزار نظر آتے تھے۔ یہ لوگ بہت کم بولتے یا خلاؤں میں گھورتے نظر آئے یا سفید فاموں سے نفرت کا اظہار کرتے۔ اس علاقے میں رہنے والوں کو ہر سفید چیز سے نفرت ہے۔ یہاں غریبوں، بے کاروں اور بیروزگاروں کی اکثریت ہے۔"(۱۳)

"دیکھا تیرا امریکہ" رضاء الحق صدیقی کا ایسا سفر نامہ ہے جس میں مصنف امریکی سماج اور معاشرت کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کو اپنے جذبات اور کیفیات سے آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ تخیلاتی فضا ہموار کرنے نے ان کے سفر ناموں کو تخلیقیت سے بھرپور بنا دیا ہے۔ یہ سفر نامہ ایک ایسا معاشرتی اور تہذیبی مکالمہ ہے جس میں اگر امریکہ کے ظاہری حسن کو سراہا گیا ہے تو اس کے سماجی تضادات و مذہبی تعصبات اور سیاست کے سرمایہ دارانہ نظام پر کڑی تنقید بھی کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ رضاء الحق صدیقی کی یہ تحریر امریکی سماج اور سیاست کو سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

مختلف ممالک کی سیر کرتے کرتے ان کی تہذیب و ثقافت، معاشرت و معیشت، سیاست و قانون کا مشاہدہ کرنا کوکب خواجہ کا دل پسند کام بن گیا۔ امریکہ کی سیاحت سے قبل انھوں نے وہاں سے متعلق بھرپور معلومات حاصل کیں۔ اپنے علم کو تجربے اور مشاہدے کی بنا پر پرکھتے ہوئے ایک معتبر رائے قائم کرنا ان کی سیاسی، تاریخی اور سماجی آگہی کا بین ثبوت ہے۔ ادبی حس سے کام لیتے ہوئے اپنی آرا، احساسات اور تجربات کو ضبطِ تحریر میں لانا ان کے اس سفر نامے "ہیلو امریکہ" کی خصوصیت ہے۔ کوکب خواجہ کو امریکہ میں ہر جگہ قدرتی مناظر دیکھتے ہوئے اپنے وطن کی یاد آجاتی ہے۔ میری لینڈ اور پیٹرس برگ کے سبزہ زار، گلیات کی جبکہ پہاڑی کے اطراف بل دار سڑک سے شہر کے نظارے پر انھیں مارگلہ ہلز سے اسلام آباد کا نظارہ یاد آگیا۔ حتیٰ کہ ایک جگہ تو انھیں اپنے گھر کا ہو بہو نقشہ لگی۔ بقول مصنفہ:

"ایک پوائنٹ ایسا بھی تھا جہاں سے جب بھی میں گزرتی تھی ہمیشہ کہہ اٹھتی! اوہ یہ تو بالکل ڈونگہ گلی میں ہمارے سمرہاؤس کی طرح کا نظارہ ہے۔ مجھے دنیا کے ہر ملک میں کہیں نہ کہیں اپنے ملک کی جھلک ضرور دکھائی دے جاتی ہے۔"(۱۴)

کوڑا پھینکنے اور اٹھانے کا منظم نظام دیکھ کر انھیں اپنے وطن کے کچرا دانوں سے باہر کا ڈھیر یاد آجاتا ہے۔ کوکب خواجہ یہاں کی

معاشرت اور رہن سہن پر بھرپور تبصرہ کرتی ہیں کہ دراصل امریکہ 'فرسٹ ورلڈ' ہے کیونکہ یہاں انسان کیا جانوروں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ جانوروں کا سرکاری یتیم خانہ ہے، جہاں چرند پرند حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے بھی موجود ہیں۔ اس صورتِ حال کو مصنفہ مضحکہ خیز انداز میں یوں بیان کرتی ہیں کہ:

> "ایک کہاوت ہے فلاں سے جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اب اس کہاوت کو یوں کہنا چاہئے کہ کاش امریکہ کے جانوروں جیسا سلوک کیا جائے، بے شمار لوگ انسانوں کی بجائے جانوروں جیسے سلوک کو ترجیح دینے لگیں گے۔"(۱۵)

مصنفہ نے وہاں کے سماج اور ثقافت کا مشاہدہ کرتے ہوئے بتایا کہ امریکہ میں مختلف موسمی پرندوں کی آمد پر تہوار ہوتے ہیں۔ شائقین اس ثقافت سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ مصنفہ کی سماجی بصیرت تھی کہ جس کے سبب انھیں مختلف ممالک اور قومیتوں کے لوگ صرف امریکی ہی لگے۔ اس سرزمین میں چینی، جاپانی، انڈین، افریقی سب اپنی اپنی پہچان رکھنے کے باوجود امریکی ہیں۔

واشنگٹن کے نواح میں مصنفہ نے افریقی امریکنز (کالوں) کا علاقہ بھی دیکھا جو اُن غلام مزدوروں کی نسلیں ہیں جنھیں تعمیرِ شہر کے بعد حکومت نے وہاں مستقل رہنے دیا۔ گویا امریکی حکومت کی تاریخ عوام دوست اقدامات کی طرف دار بھی نظر آتی ہے۔ ڈینش اور ہالینڈ کی تہذیب کا حامل شہر سولوانگ (Solvang) آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی قدیم تہذیب کا نمونہ ہے۔ یہاں "لِٹل بنگلہ دیش" غالباً بنگلہ دیشیوں نے ہی اپنے وطن کے نام پر آباد کیا ہو گا۔

مصنفہ نے امریکی سماج کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور قارئین کو آگاہ کیا کہ امریکہ میں ویک اینڈ پر کسی تہوار کی طرح بچے الگ پرجوش ہوتے ہیں اور والدین الگ۔ مصنفہ آزادانہ زندگی گزارنے کے حق میں کی جانے والی پریڈ کا نظارہ کرنے سیئین، ریمون سے سان فرانسسکو تک گئیں جہاں ہر رنگ و نسل کے انسانی حقوق کے داعی تھے۔ مرد عورتوں کی طرح بنے سنورے اور لڑکیاں تقریباً بے لباس۔ ہر انسان کو ہر طرح سے جینے کی آزادی میسر ہے۔ مصنفہ امریکی عوام کا موازنہ تیسری دنیا کے باشندوں سے کرتے ہوئے سوچتی ہیں کہ:

> "یہ آزاد دنیا ہے مرضی سے جئیں اور مرضی سے اپنا کام کریں۔ ہم تھرڈ ورلڈ کے لوگ تو زندگی گزارتے ہی دوسروں کی مرضی سے ہیں۔۔۔ ہمارے سروں پر صرف ایک فقرے کی تلوار لٹک رہی ہوتی ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، اور اسی میں زندگی گزر جاتی ہے۔"(۱۶)

لاس ویگس امریکی ریاست نویڈا کا شہر دنیا بھر میں جوئے خانوں، شاپنگ، اعلیٰ کھانوں اور نائٹ کلبوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ امریکہ کا امیر ترین، سیاحوں کی جنت کہلانے والا شہر ہے جو تفریح کے لحاظ سے دنیا کا کیپٹل یا Sin City یعنی "گناہوں کا گڑھ" بھی کہلاتا ہے۔ مصنفہ امریکی خواتین کی تگ و دو دیکھتی ہے اور اپنے سماجی شعور کی بدولت پاکستانی عورت سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے تبصرہ کرتی ہے کہ:

> "یہاں پر دیگر گھریلو مصروفیات تو اپنی جگہ ہیں جن میں کوکنگ، لانڈری، استری، گراسری، گھر کی صفائی وغیرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ خواتین کی بڑی اہم ذمہ داری ڈرائیونگ بھی ہے۔"(۱۷)

وہاں کی خواتین کا موضوع سخن حالیہ فیشن اور جھوٹی قسم کی تعریفیں نہیں بلکہ بچوں کی نصابی وہم نصابی سرگرمیوں سے لے کر انتخابات تک ہوتا ہے۔ وہاں تعلیمی اداروں کی کارکردگی کی بنیاد پر اردگرد کا علاقہ مہنگا یا سستا ہوتا ہے۔ مصنفہ نے امریکی عوام کو قانون کی پاس داری کرنے والا پایا۔ انھوں نے دیکھا کہ کیلی فورنیا کے مکینوں کو ایک "ایمر جنسی کارڈ" ملا جس میں پانی کے پچیس فیصد استعمال میں کمی کا کہا گیا۔ قانون کی خلاف ورزی پر کسی ہمسائے کی طرف سے شکایت ہو جائے تو بھاری جرمانہ ادا کیے بنا چارا نہیں۔ نظم وضبط کا اعلیٰ معیار ہی ہے جس نے اس قوم کو برتر بنا دیا۔ مصنفہ ٹرام پر سفر کے دوران ایک ہجوم کا احوال بتاتی ہیں کہ:

> "میں پیچھے نظر دوڑاتی ہوں لمبی قطار ہے مگر کمال صبر سے ہر کوئی کھڑا ہے۔ مجال ہے پیچھے سے آگے آنے کی کوشش کوئی کرے۔ چینی، جاپانی غرض ہر ملک کی الگ الگ صورتیں تو ہیں مگر کہلاتے سبھی امریکی ہیں۔"(۱۸)

مصنفہ امریکی سماج پر پُر مغز تبصرہ کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ یہاں کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی اعتماد اور ذہنی بلوغت دکھائی دیتی ہے۔ خود داری اور خود انحصاری کا جو سبق اس معاشرے میں ہے وہ یہاں کے نوجوانوں کو قبل از وقت ذمہ دار بنا دیتا ہے۔ کوکب خواجہ اپنے ملک کے نوجوان کا مقابلہ امریکی نوجوان سے کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

> "پاکٹ منی بنانے کے لیے کوئی بھی کام خواہ کسی ریسٹورنٹ میں صفائی کا کام کریں یا پھر بیرا گیری۔ کسی کام کو کرنے میں انھیں عار نہیں ہوتا۔ میں اپنے ہاں کے بچوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ صاحبِ حیثیت والدین کے بچے ایسے کام کرنے پر کبھی تیار ہوں۔"(۱۹)

مصنفہ نے واشنگٹن ریاست کے شہر Seatle کو عوامی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا۔ وہاں مختلف قسم کے میلوں اور تہواروں میں پانی کے جہازوں کی ریس، بوئنگ، ایئر شو، فلم فیسٹیول، میوزک اینڈ آرٹ فیسٹیول وغیرہ شامل ہیں۔ موسم سرما میں برف آلود پہاڑ دیکھنے اور کھیلنے ہر دو سرگرمیوں کے لیے بہترین ہیں۔ مچھلی اور انگور وہاں کی خاص خوراک ہیں کہ شراب بنانے کی فیکٹریوں کا انحصار انہی انگوروں پر ہے۔ کوکب خواجہ کے خیال میں یہ مذہبی رواداری کا عملی مظاہرہ ہے جو میری لینڈ میں مندر، گردوارہ اور چرچ ایک ہی لائن میں ہیں۔ مصنفہ کو جب میری لینڈ میں چودہ اگست گزارنی پڑی تو وہ کلر فُل کلچر کے "سِکس فلیگز تھیم پارک" چلی گئیں جہاں سپین کا کلچر، کاؤبوائے کلچر، فرانس کا کلچر گویا نقلِ مکانی کر کے آنے والوں کی تسکین کا سارا سامان میسر تھا۔

کوکب خواجہ نے امریکی سماج میں بنیادی انسانی حقوق کی پاس داری کے جو معاملات دیکھے وہ عین اسلامی تعلیمات پر مبنی تھے۔ مصنفہ نے اپنے سماجی شعور کی بدولت قارئین کو آگاہ کیا کہ امریکہ میں کئی مقامات پر بورڈ پر آنکھ بنی ہوئی ہے جسے "Neighbours Eye" کہا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے "ہمسائے ایک دوسرے کا خیال رکھیں اور مدد کریں" جبکہ وطن عزیز میں یہ بات مذہب میں "ہمسایوں کے حقوق" اور سماج میں "ہمسایہ ماں جایا" تک محدود ہے۔

کوکب خواجہ ہلکے پھلکے انداز کے حامل مزاح سے مزین اسلوب سے قارئین کے دلوں کو لبھاتے ہوئے اپنے مدعا کو بیان کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کیے جانے والے اسفار کو سپرد قلم کر کے نہ صرف حدودِ ادب میں داخل ہوئیں بلکہ عوام

کو بھی دلچسپ اور سادہ انداز میں معلومات فراہم کر کے ان کے دلوں میں گھر کر لیا۔ ممتاز مفتی نے انھیں "سچے جذبوں کی ترجمان" کہا، احمد ندیم قاسمی نے ان کی تحریر کی سادگی اور سچائی کی تعریف کی، نیز انھیں امجد اسلام امجد کی زبانی یہ مژدہ بھی سننے کو ملا کہ ان کی کتاب "نی ہاؤ" (جاپان کا سفر نامہ) ڈاکٹریٹ کرنے والوں کے نصاب میں شامل کی گئی ہے۔[۲۰]

"ہیلو امریکہ" کوکب خواجہ کا ایسا سفر نامہ ہے جس میں وہ سفر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے قارئین کو بھی اپنے اُن لمحات میں شریک کر لیتی ہیں جو اُنھوں نے غور و فکر، مشاہدے یا حظ اٹھاتے ہوئے گزارے۔ مصنفہ امریکی زندگی کی رعنائیوں سے مرعوب تو ہوتی ہیں لیکن وہاں کی مشینی زندگی، جس کا انت تنہائی ہے، کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ فرسٹ ورلڈ کے باشندوں کا ملکِ پاکستان کے لوگوں سے موازنہ اور مقابلہ ان کا دل پسند مشغلہ ٹھہرا۔ اِس شغل بازی میں بعض مقامات پر ان کا اظہارِ تشکر بھی نظر آتا ہے اور کچھ جگہوں پر اک حسرت بھری آہ بھی۔ مصنفہ کی یہ تحریر امریکہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ایک جاندار اور بھرپور سیاسی و سماجی تبصرہ و تجزیہ ثابت ہوتی ہے۔

"امریکہ کے سو رنگ" سفر نامہ مستنصر حسین تارڑ کی سن ۲۰۲۰ء کی تخلیق ہے۔ اس سفر نامے میں مصنف ایک باذوق مسافر اور حقیقی دانشور کی حیثیت سے امریکی مناظر فطرت، سماج اور قوانین کو سراہتے ہوئے قارئین کو اپنا ہمنوا بنا لیتے ہیں۔ نیویارک میں مصنف کی آمد پر ان کے دوست، ممتاز حسین نے ان کے اعزاز میں ایک پروگرام رکھا جس میں منٹوں سیکنڈوں تک کو پیسے میں تولنے والے غیر ملکی امریکی باشندے بہر طور پہنچے تھے۔ مصنف نے جب "آٹوا" ایئرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر پر تعینات ایک کینیڈین خاتون کا مخصوص رویہ دیکھا تو حیران رہ گئے کہ واقعی کینیڈین عوام کا امریکی لوگوں سے رویہ متعصبانہ ہی ہے۔ اس سلسلہ میں مصنف کا سیاسی بصیرت پر مبنی تبصرہ ہے کہ:

> "اسی مخاصمت کی وجہ سے گیارہ ستمبر کے دن جڑواں مینار مسمار کر دیئے گئے اور امریکہ میں کم از کم غیر قانونی مسلمانوں پر جو عتاب نازل ہوا تو ان میں سے بیشتر نے کینیڈا کا رُخ کیا اور انھیں بخوشی قبول کر لیا گیا۔"[۲۱]

تارڑ صاحب کے مطابق مانٹریال قدیم یورپی شہر ہے جس کی ثقافت، رہن سہن، لباس، موسیقی اور کھانوں میں پنجاب کی مانوس جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مصنف کو ٹورنٹو اور مانٹریال دونوں معاشرتوں کے پروردہ افراد کے طرز زندگی میں نمایاں فرق نظر آیا جو ان کی اپنی اپنی پہچان ہے۔ اس سلسلہ میں تارڑ صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> "جہاں ٹورنٹو ایک چھوٹا سا نیویارک ہے، انگریز رکھ رکھاؤ اور رواجوں کی ذہنیت کا شہر ہے۔ وہاں مانٹریال کے گلی کوچوں اور عمارتوں کے روپ میں پیرس کی خوشبو ہے۔۔۔ یہ شخص ٹورنٹو کا ہے کہ وہ اکڑا چلا آ رہا ہے اور ٹویڈ کے کوٹ میں ملبوس ہے اور اس کی مونچھیں تمباکو کے دھوئیں سے بھوری ہو رہی ہیں اور یہ حضرت یقیناً مانٹریال کے ہیں کہ ذرا بانکے اور چھیل چھبیلے ہیں اور ایک انداز سے چلتے ہیں اور کھانے کے ساتھ بیئر کی بجائے ارغوانی مشروب کو عزیز رکھتے ہیں۔"[۲۲]

مصنف کی سماجی بصیرت نے مانٹریال کو ایک ''فراخ دل شہر'' کے طور پر جانا کہ وہاں کشکول بھرنے والے بے شمار ہیں۔ بہت سے پاکستانیوں نے بھی گواہی دی کہ سہارے سے چلنے والے افراد جب کلیسا کی چوٹی چھو آئیں تو اکثر شفایاب لوٹتے ہیں۔ مختلف مذاہب کے پیروکار حتیٰ کہ لادینیت کے حامی افراد بھی عقیدت مندوں میں شامل ہیں۔ وہاں بہت سی متروک بیساکھیاں اور وہیل چیئرز ان کی شفایابیوں کی گواہ ہیں۔

مصنف نے کیوبا کے سماج پر غور و فکر کیا تو اس کے نواح کو بے ہنگم، صاف ستھرا اور شانت صوفی شہر قرار دیا جس کے طرزِ تعمیر میں پیرس کی دلکشی تھی۔ مصنف کو کیوبا اپنے کراچی کی یاد دلاتا رہا جہاں کے آباد کار زیادہ تر مہاجر ہیں۔ دنیا میں آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ ڈاکٹر، اسی بہترین میڈیکل سسٹم کی دین ہیں۔ کشمیر کے زلزلہ میں سب سے زیادہ میڈیکل سٹاف اور ادویات کاسترو ہی کی طرف سے پاکستان بھجوائی گئی تھیں۔ وہاں کی خواتین فرانس کے زیرِ اثر حسن و جمال سے بھرپور اور نزاکت میں اپنے حسن سے بخوبی واقف تھیں۔ کیوبک کے لیے تارڑ صاحب کا کہنا ہے کہ اس کو دیکھنے کے بعد انسان بس مر جائے، کہ پھر زندگی میں کچھ کرنے کو باقی نہیں بچتا۔

کیلگری کی معیشت کا دارومدار وہاں کے تیل اور گیس کے ذخائر پر ہے۔ یہاں ایسے خوبصورت مقامات ہیں کہ دنیا بھر کے سیاح بالخصوص جاپانی یوں آتے ہیں کہ انہی کے مسکن لگتے ہیں۔ جان لیوا برفانی وحشت والے اس شہر کو مصنف نے تنہائی کا شکار پایا۔ خوراک اور رہائش سے محروم افراد سے امریکی معاشرت بھی پاک نہیں۔ اگر کوئی مسلمان ان کی مدد کرے تو وہ حیران ہوتے ہیں کہ مسلمان تو صرف اسامہ بن لادن جیسے شدت پسند ہوتے ہیں۔ مصنف پاکستان اور عرب ممالک دونوں کے اسلامی اقدار کے زوال پر متفکر ہیں۔ ان کا عالمی سیاست، سماج، تاریخ اور مذہب کے افکار پر مبنی تبصرہ نہایت اہم ہے کہ:

> "میرا یقین ہے کہ اگر اسلام کی عظمتِ رفتہ کے بحال ہونے کے امکان ہیں تو یہ یورپ اور امریکہ میں ہیں۔ پاکستان اور سعودی عرب وغیرہ میں نہیں"(۲۳)

مستنصر حسین تارڑ تقریباً ہر برس موسم گرما امریکہ کی ریاست فلوریڈا میں گزارتے ہیں جہاں کے موسم سہانے اور ساحل نیلگوں ہیں۔ امریکہ کے قریب المرگ امیر بوڑھے یہیں جاتے ہیں کہ نسوانی حسن بکثرت دیکھنے کو ملتا ہے۔ میامی کو مصنف نے گناہگاروں کی جنت پایا، جس کا تعارف ان کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

> "مائی آرلینڈو سے مسلسل تین گھنٹے کی مسافت پر واقع سمندری شہر تھا۔ امریکہ بھر کے امیر بوڑھوں، منشیات فروشوں، معزز ہو چکے جرائم پیشہ افراد، خوش بدن ہر رنگ و روپ کی حسین طوائفوں، گینگسٹر حضرات اور دنیا بھر کے سورج اور ساحلوں کے پجاری سیاحوں کا شہر تھا۔"(۲۴)

مستنصر حسین تارڑ جب امریکہ کے جنوبی اختتام پر موجود قصبے ''کی ویسٹ'' کی طرف رخ کرتے ہیں تو وہاں کے سرخ کلغی والے مرغ کو قانونی تحفظ میں پاتے ہیں۔ ایک جگہ کچھوؤں کے ہسپتال میں بیمار، بزرگ اور لاوارث ہر قسم کے کچھوؤں کے بہترین

انتظامات دیکھتے ہیں۔ امریکی معاشرت کی خاصیت ہے کہ اس میں جانوروں، حیوانوں، چرند پرند حتیٰ کہ درندوں اور مکوڑوں کے تحفظ کے لیے بھی اقدامات ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے نیویارک کے کوچوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے شاہد چغتائی کے قول کی تصدیق کی کہ یہاں جیسی بھی عورت کا تصور کریں گے چند منٹ کے بعد وہ سامنے ہو گی اور یہ معاملہ صرف عورت کی حد تک محدود نہیں۔ مصنف کے مطابق:

> " یہ رنگا رنگی صرف انسانوں میں ہی نہیں نیویارک کے تہواروں، میلوں ٹھیلوں اور کھانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی کھانے کو تصور میں لائیے وہ کسی نہ کسی ریستوران میں میسر آجائے گا۔"(۲۵)

مصنف نے مختلف پالیسیوں کا جب ناقدانہ بصیرت سے موازنہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ امریکہ کا گھمنڈ ہے جس نے عراق، افغانستان اور لیبیا کو میدانِ جنگ بناڈالا اور بے شک وہ اسرائیل کی بھی پُشت پناہی کرتا ہے لیکن پھر بھی دنیا بھر کے مقابلہ میں سب سے زیادہ مذہبی آزادی یہیں پر ہے۔ بقول مصنف:

> "یہ نیویارک کا یہودی میئر ہے جو مسمار شدہ جڑواں ٹریڈ سینٹر کے ملبے کے قریب مسلمانوں کو 'قرطبہ ہاؤس' تعمیر کرنے کی اجازت دیتا ہے کہ یہ ان کا آئینی حق ہے۔"(۲۶)

مستنصر حسین تارڑ کے خیال میں نہ تو یورپ کے پاس اجناس ہیں نہ مصالحہ جات، نہ خوشبوئیں اور نہ ہی ذائقے۔ صرف تنظیم اور معیار کی برقراری نے عالمی سطح پر میکڈانلڈ، پیزا ہٹ، کے ایف سی، ڈنکن ڈونٹس، اور سب وے جیسی فوڈ چینز کی مانگ میں اضافہ کیا ہوا ہے۔ یہ کسی بھی مسافر کو اس کے اپنے گھر اور ملک میں ہونے کے احساس کو اجاگر کرتی ہیں۔ امریکہ میں سینکڑوں ثقافتیں اور کئی مذاہب کے لوگ ہیں، انھوں نے مشترکہ معبد خانوں کے لیے معروف کھلاڑیوں، فن کاروں اور سیاستدانوں کو اپنا خدا بنالیا۔ تارڑ صاحب کے مطابق:

> "مائیکل جیکسن، جیک کینیڈی اور ابراہیم لنکن سب کے سب امریکی روحانی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مجسمہ آزادی، گرینڈ کینین، ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، کرائسلر بلڈنگ، راک فیلر سنٹر، ٹائمز سکوئر، ففتھ ایونیو، پارک ایونیو، مین ہیٹن، کوئنز برج۔ یہ سب امریکیوں کے معبد ہیں۔"(۲۷)

مصنف امریکہ کی سیاست کو لائقِ تنقید سمجھتے ہیں کہ وہ کمزور ممالک پر جنگ مسلط کرنے والا ملک ہے۔ اس کے باوجود مصنف کی سیاسی اور سماجی بصیرت منتج ہے کہ امریکہ نے اپنی سرزمین پر جو مذہبی آزادی دے رکھی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اگر امریکہ کے آئین کی پاسداری کرتے رہو تو ہر قسم کی آزادی کی زندگی آپ کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ مصنف جب وہاں کی مٹی اور پیداوار پر غور کر رہے تھے تو ان کی نظر ٹیولپ (گلِ لالہ) پر پڑی جو ترکی سے مستعار لیا ہوا پودا تھا۔ امریکی جس بھی شے، فرد، مذہب، ثقافت یا علاقے کو اپنے دامن میں سمو لیتے ہیں وہ ان کی ہو کر ان کی ہی دِکھنے لگتی ہے۔ تارڑ صاحب نے اپنا آخری دورہ والٹ وہٹ مین کے گھر کا کیا جسے

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

حکومت نے قومی ورثہ کے طور پر محفوظ کر لیا ہوا ہے۔ یہ ایک اَن پڑھ شاعر تھا جس کی شاعری کی کتاب "لیوز آف گراس" عالمی شہرت کی حامل ٹھہری، جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

"لیوز آف گراس۔۔۔ میں تصوف، قدرتی مناظر، جنس اور سیاسی شعور یکجا ہو گئے ہیں۔"(۲۸)

مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کی انفرادیت، ان کا عمیق مشاہدہ، ذوقِ سفر اور منفرد اُسلوب ہے۔ "امریکہ کے سو رنگ" میں مصنف نے امریکہ کی دو ریاستوں کینیڈا اور نیویارک کے مختلف تضادات، رنگوں، اور خوبصورتیوں کا ذکر کیا ہے۔ اپنے شعور، علم اور تجربات کی بدولت امریکی ریاستوں کے سماج اور سیاست پر مصنف نے بلاواسطہ اور بلواسطہ جو بھی تبصرے کیے ہیں وہ کماحقہ درست معلوم ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی چونکہ متجسس مسافر اور فنکار ہیں اس لیے وہ امریکی عوام کی سچائی کی تلاش اور حق بات کا ساتھ دینے کی روش کو پسند کرتے ہیں۔ المختصر یہ سفر نامہ بھی مستنصر حسین تارڑ کے مقبول ترین سفر ناموں میں سے ایک ہے، جس نے مصنف کی شہرت کی بلندیوں کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس تحریر میں اکیسویں صدی کے، چار مختلف مصنفین کے، امریکی سفر ناموں کا سیاسی و سماجی تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو زمانی اعتبار سے مختلف سنین میں منظرِ عام پر آئے۔ یہ سفر نامے نہ صرف کثیر الثقافت امریکہ کی سیاحت سے متعلق معلومات کا خزینہ ہیں بلکہ بین الاقوامی میڈیا کی عکاسی سے بڑھ کر غیر جانبدارانہ طور پر حقائق کا بیانیہ بھی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی کے دور میں جب دنیا گلوبل ولیج بن گئی ہے تو سپر پاور امریکہ کے اندرونِ ملک معاملات اور بیرونِ ملک تعلقات سے اس خطہ ارضی پر موجود ہر علاقہ متاثر نظر آتا ہے۔ تیسری دنیا کے باشندے فرسٹ ورلڈ کی عوامی زندگیوں اور حکمرانوں کی حکمتِ عملیوں کو جاننے کے لیے بے تاب رہتے ہیں کہ کس طرح امریکہ ترقی کرتے ہوئے عالمی سطح پر اپنی دھاک بٹھاتا جا رہا ہے۔ یہ سفر نامے ایسے میں قارئین کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ ان سفر ناموں میں مصنفین نے مشترکہ طور پر امریکہ کی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سماج میں رنگ و نسل کے تفاوت، سرمایہ دارانہ نظام، آزادانہ جنسی اختلاط، نسبتاً کمزور خاندانی نظام، ضعیف العمری کی تنہائی اور بے بسی، مادیت پرستی، گَن کلچر کے فروغ، بے گھری کے مسائل، انتخابی نظام میں پیچیدگیاں، اندرونی سیاسی نظریاتی تصادم، امیگریشن اور مہاجرین کے لیے سخت قوانین اور کمزور ممالک میں غیر قانونی مداخلت جیسے مسائل کو اجاگر کیا ہے جو بعض ناقدین کی نظر میں ابھی بھی حل طلب ہیں۔ قارئین ان سفر ناموں کی بدولت امریکی شہروں کی ترقی، نظم و ضبط، قانون کی پیروی، صفائی کے نظام، روبوٹک ٹیکنالوجی کے فروغ، عوامی احتجاج کے کلچر، آزادیِ اظہار، اداروں کی خود مختاری، آزادیِ مذہب، تعلیم و صحت کے نظام، انسانوں حتیٰ کہ جانوروں کے حقوق کی پاس داری جیسی اس ملک و قوم کی اُن خصوصیات سے آگاہ ہوتے ہیں جو امریکہ کو ترقی پسند بناتی ہیں اور یہی زندگی تیسری دنیا کے باشندوں کا خواب بھی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب میں سفر نامہ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، طبع دوم، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۶۴
۲۔ فاروق عادل، ایک آنکھ میں امریکہ، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۷

۳۔ ایضاً، ص ۷۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۷۔ ایضاً، فلیپ

۸۔ رضاء الحق صدیقی، دیکھا تیرا امریکہ، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۶-۲۷

۹۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۱۴۔ کوکب خواجہ، ہیلو امریکہ، جمہوری پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۰-۱۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۹

۲۱۔ مستنصر حسین تارڑ، امریکہ کے سو رنگ، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۲۱

۲۲۔ ایضاً، ص ۳۷-۳۶

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۸۵

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۴۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۹۶

References in Roman Script:

1. Anwar Sadeed, Dr,Urdu adab mein Safarnama, Maghrbi pakistan urdu academy, Lahore,taba dom,2017,p.64
2. Faroq adil, Aik ankh mein America, Dost publications, Islamabad, 2011, P.17
3. Ibid, p.71
4. Ibid, p.106
5. Ibid, p.142
6. Ibid, p.141
7. Ibid, p.Flap
8. Raza ul haq siddiqi, Dekha tera America, Zahid bashir printers,lahore, 2016, p.26-27
9. Ibid, p.47
10. Ibid, p.112
11. Ibid, p.64
12. Ibid, p.120
13. Ibid, p.159
14. Kokab Khawaja, Hello America, Jamhori publications, Lahore, 2018, P.19-20
15. Ibid, p.26
16. Ibid, p.45
17. Ibid, p.40
18. Ibid, p.80
19. Ibid, p.39
20. Ibid, p.09
21. Mustansar Hussain tarar, America kay so rang, Sang e mil Publications, Lahore, 2020, p.21
22. Ibid, p.36-37
23. Ibid, p.73
24. Ibid, p.85
25. Ibid, p.145
26. Ibid, p.146
27. Ibid, p.151
28. Ibid, p.196

Ms. Nayab Tahir is currently pursuing a PhD in the Department of Urdu at the University of Education, Lower Mall Campus, Lahore, Pakistan. She is also serving as a teacher in the Punjab Education Department. She earned her MPhil in Urdu from the International Islamic University, Islamabad.

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

تحقیقی وتنقیدی مجلّہ
دریافت

انڈیکس

مقالہ نگار	عنوان	صفحات نمبر	ملخص	کلیدی الفاظ
ڈاکٹر آئی کوت کشمیر / زینب بوزکور	ترک فکریات میں مابعد جدیدیت: ناقدین کی آرا کی روشنی میں خصوصیات کا جائزہ	۱ - ۱۳	یہ مقالہ ترکی کے فکری حلقوں میں مابعد جدیدیت کے ادبی و فکری اثرات کا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ بالخصوص پروفیسر ڈاکٹر یلدز ایجوویت کی کتاب اور دیگر ترک ناقدین کی آرا کی روشنی میں مابعد جدیدیت کی فکری جہات، اسلوبیاتی تکنیکی، اور ادبی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالے میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تقابلی نکات، میٹا فکشن، بین المتونیت، اور کثرتیت جیسے تصورات کو واضح کیا گیا ہے۔ اس مطالعے کا مقصد نہ صرف ترک ادب میں مابعد جدید تحریک کی خصوصیات کو اجاگر کرنا ہے بلکہ اردو قارئین کے لیے اس موضوع کو آسان فہم انداز میں پیش کرنا بھی ہے۔	مابعد جدیدیت، میٹا فکشن، بین المتونیت، ترکی، اسلوبیاتی، جدیدیت۔
ڈاکٹر کامران عباس کاظمی	عصریت اور ناول :ناول کی تنقید کا ایک نیا زاویہ	۱۴ - ۲۲	ناول محض ایک بیانیہ فن پارہ نہیں یہ سماجی، ثقافتی اور فکری شناخت کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس مقالے میں ناول کی تنقید کے ایک منفرد زاویے کو مرکزی نکتہ بنایا گیا ہے۔ یہ زاویہ ناول کی تفہیم کو نظریاتی جکڑبندیوں سے آزاد کرتے ہوئے اسے اس کے اصل سماجی، تاریخی، نفسیاتی اور تہذیبی سیاق وسباق میں سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ ناول چونکہ زندگی کی ہمہ گیریت، تہہ داری اور تغیرات کا آئینہ دار ہوتا ہے، اس لیے اس کا مطالعہ عصری تناظر میں کیے بغیر اس کی معنویت پوری طرح آشکار نہیں ہو سکتی۔ مضمون میں اس مؤقف کے تحت یہ استدلال پیش کیا گیا ہے کہ ناول کی تنقید کو کسی مخصوص نظریے یا ازم تک محدود کرنے کے بجائے اس کے سماجی و تاریخی سیاق کے ساتھ جوڑ کر پڑھنا زیادہ بامعنی اور بامقصد ثابت ہوتا ہے۔	تنقید، ناول، نظریاتی، عصریت، سماجی، تاریخی، ثقافتی، نفسیاتی، تغیرات۔
منیر عباس / ڈاکٹر منور امین	ناصر عباس نیر کے افسانوں کی تحلیل: بیانیہ، فکر اور موضوعاتی جہات	۲۳ - ۴۹	یہ مقالہ اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیئر کے افسانوی ادب کا فکری و تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے۔ مقالے میں ان کے افسانوں کے بیانیہ اسلوب، فکری جہات اور موضوعاتی تنوع کو واضح کیا گیا ہے۔ خاص طور پر نو آبادیات، شناخت، طاقت، جبر، ثقافت اور بین المتونیت جیسے موضوعات پر ان کے فنکارانہ اظہار کو بنیاد بنا کر تجزیہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ ناصر عباس نیئر کے افسانوی ادب کی فکری	نو آبادیات، شناخت، طاقت، جبر، ثقافت، بین المتونیت

Research Journal DARYAFT
ISSN (E): 2616-6038, ISSN (P): 1814-2885
Volume 17. Issue 01, June 2025

			گہرائی، علامتی معنویت اور جمالیاتی خوبیوں کو اجاگر کرتا ہے۔	
ڈاکٹر سیدہ طیبہ رباب	مولانا حالی کی اصلاحی فکر اور اقبال کی شاعری: تجزیاتی مطالعہ	۵۰ - ۵۶	اردو ادب کی دو عظیم شخصیات، مولانا الطاف حسین حالی اور علامہ محمد اقبال کے فکری رشتے اور ادبی اثرات کا تجزیاتی مطالعہ اس مقالے میں پیش کیا گیا ہے۔ حالی نے اردو شاعری، خصوصاً غزل کو روایتی موضوعات سے نکال کر قومی شعور، اصلاحِ قوم، اور جدید فکر سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی مسدس مدوجزر اسلام نے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں بیداری کی لہر دوڑادی۔ علامہ اقبال، جو حالی کی فکر سے متاثر تھے، اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو خودی، عمل اور امید کا پیغام دیتے ہیں۔ اس مضمون میں دونوں شعرا کے کلام میں فکری ربط، تہذیبی شعور، اور اصلاحی جہتوں کا موازنہ کیا گیا ہے، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالی کی اصلاحی بنیاد پر اقبال نے اردو شاعری کو ایک نئی فکری بلندی عطا کی۔	شخصیات، شاعری، اصلاحِ قوم، برصغیر، مدوجزر اسلام، ملتِ اسلامیہ، خودی۔
ڈاکٹر سارہ مجید/زنیرہ صدیق	انیس اشفاق کے ناول "ھیچ" میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی وسماجی صورتحال	۵۷ - ۶۴	انیس اشفاق کا ناول "ھیچ" ہندوستان کے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی منظرنامے میں مسلمانوں کی شناخت، بقا اور خوف کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں، کو درپیش امتیازی سلوک، مذہبی تعصب اور شدت پسند سیاسی نظریات کے پس منظر میں تحریر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے مخصوص اسلوب اور علامتی بیانیے کے ذریعے ہندوستانی معاشرے میں موجود تضادات کو نہایت فنی مہارت سے اجاگر کیا ہے۔ یہ مقالہ ناول "ھیچ" کے توسط سے ہندوستانی مسلمانوں کی حالتِ زار، ان کے نفسیاتی اور تہذیبی بحران، اور ریاستی جبر کے خلاف ایک فکری احتجاج ہے۔	ھیچ، تعصب، امتیازی سلوک، سیاسی، سماجی، علامتی، نفسیاتی، تضادات۔
ڈاکٹر محمد رمضان	"سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" میں جادوئی حقیقت نگاری	۶۵ - ۷۷	داستانوی ادب کی کلاسیکی روایت میں سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی دو ایسی اہم داستانیں ہیں جن میں جادوئی حقیقت نگاری کے عناصر اپنی مکمل تہذیبی، تخیلاتی اور ماورائی صورتوں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں۔ جدید اصطلاح "میجکل رئیلزم" (جادوئی حقیقت نگاری) کو اگرچہ فکشن کی دنیا میں بیسویں صدی میں شناخت ملی، لیکن اس کے بیج برصغیر کی قدیم داستانوں میں پہلے ہی بوئے جا چکے تھے۔ ان داستانوں میں تخیل، دیومالائی کردار، طلسماتی فضا اور ماورائے عقل عناصر ایک ایسی	داستانوں، حقیقت نگاری، تخیلاتی، سنگھاسن بتیسی، بیتال پچیسی، جادوئی،

			کہانی تشکیل دیتے ہیں جو بیک وقت حقیقت اور فسانے کی سرحد پر کھڑی نظر آتی ہے۔ زیر نظر مقالہ سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی میں موجود جادو، دیومالا، مافوق الفطرت عناصر اور انسانی کرداروں کی فوق العادہ صفات کو "جادوئی حقیقت نگاری" کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔	
ڈاکٹر غزل یعقوب / ڈاکٹر محمد امجد	طاہرہ اقبال کے افسانوں میں ثقافتی تصادم کا لسانی اظہار: ایک بین الثقافتی مطالعہ	۷۸ - ۸۹	عالمگیریت کے اس دور میں جب زبانیں اور ثقافتیں ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں، مقامی ثقافتی اور لسانی شناختیں شدید دباؤ کا شکار ہو رہی ہیں۔ اردو افسانہ بالخصوص وہ افسانے جو دیہی اور علاقائی پس منظر سے جڑے ہوئے ہیں، اس ثقافتی و لسانی کشمکش کو نہایت شدت سے اپنے بیانیے کا حصہ بنا رہے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا تخلیقی منظر نامہ ایسے ہی تناظر میں ابھرتا ہے، جہاں ان کے افسانے نہ صرف پاکستانی دیہی ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ عالمی ثقافتی اثرات کے ساتھ پیدا ہونے والے تناؤ، مزاحمت اور شناخت کے بحران کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زبان محض اظہار کا ذریعہ نہیں بلکہ ثقافت، شناخت اور مزاحمت کی ایک علامتی قوت کے طور پر ابھرتی ہے۔ یہی لسانی حکمتِ عملی طاہرہ اقبال کو معاصر اردو افسانے میں ایک منفرد اور فکر انگیز مقام عطا کرتی ہے، جس کا بین الثقافتی مطالعہ اس تحقیقی مقالے کا بنیادی مقصد ہے۔	افسانہ، عالمگیریت، ثقافتی ، لسانی، دیہی، عالمی، شناخت، زبان، بین الثقافتی۔
نایاب طاہر	اکیسویں صدی کے امریکی اسفار پر مبنی سفر ناموں کا سیاسی اور سماجی جائزہ	۹۰ - ۱۰۳	یہ مقالہ اکیسویں صدی کے امریکی اسفار پر مبنی اردو سفر ناموں کا سیاسی و سماجی جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس میں فاروق عادل، رضا الحق صدیقی، کوکب خواجہ اور مستنصر حسین تارڑ جیسے معروف مصنفین کے سفر ناموں کے مطالعے سے امریکہ کے سیاسی نظام، سماجی رویوں، ثقافتی تضادات، انسانی حقوق، نسلی امتیاز، آزادیِ اظہار، سرمایہ دارانہ نظام اور مذہبی رواداری جیسے موضوعات پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یہ مقالہ ان سفر نامہ نگاروں کے سفر ناموں کے مطالعے کے ذریعے امریکہ کی تہذیب و معاشرت اور سیاست کی ایک بھرپور تصویر پیش کرتا ہے، جو قارئین کو نہ صرف ایک نئی دنیا سے روشناس کراتا ہے بلکہ اُنہیں اپنی سماجی و سیاسی بصیرت کو بھی وسعت دینے کا موقع فراہم کرتا ہے۔	سفر نامہ، سیاسی، انسانی حقوق، نسلی امتیاز، سرمایہ دارانہ نظام، امریکہ، تہذیب، معاشرت۔

CONTENTS

Editorial		
Postmodernism in Turkish Thought: An Examination of its Characteristics in the Light of Critics	Dr. Aykut Kismir Zeynep Bozkir	1
Contemporaneity and the Novel: Toward a New Critical Perspective	Dr. Kamran Abbas Kazmi	14
An Analysis of Nasir Abbas Nayyar's Short Stories: Narrative, Thought, and Thematic Dimensions	Munir Abbas Dr. Munawar Amin	23
Moulana Hali's Reformic Thought and Iqbal's Poetry: Analytical Study	Dr. Syeda Tayyaba Rubab	50
The Socio-Political Condition of Indian Muslims in Anees Ashfaq's Novel "Heech"	Dr. Sara Majeed Zunaira Siddique	57
Magical Realism in "Sangha san Batesi" and "Betaal Pachesi"	Dr. Muhammad Ramzan	65
Linguistic Representation of Cultural Conflict in the Short Stories of Tahira Iqbal: An Intercultural Study	Dr. Ghazal Yaqub Dr. Muhammad Amjad	78
The Political and Social Analysis of Travelogues based on American Travels in the 21st Century	Nayab Tahir	90
Index		104

DARYAFT

Department of Urdu Language and Literature, Faculty of Languages,
National University of Modern Languages, Islamabad, Pakistan
Email: daryaft@numl.edu.pk

SUBSCRIPTION/ORDER FORM

- Please accept my subscription for……. year(s).
- Orders are accepted preferably for calendar year i.e., January to December and are non-refundable.

I enclose my Online payment receipt/Pay Order/Bank Draft No……. payable to Editor Daryaft, **National University of Modern Languages (Daryaft Subscription)** Islamabad, Pakistan.

- For Online Payments: Askari Bank Account # for Daryaft: 0550380006660, IBAN: PK72ASCM0000550380006660

Account Title: **National University of Modern Languages (Daryaft)**
Make an online payment and share the receipt on this email daryaft@numl.edu.pk

OR

- Make payments through Pay orders/ Bank Draft in the name of Editor, Daryaft and upload the receipt and send the drafts on this Postal Address:

Editor Daryaft, Department of Urdu Language and Literature, Faculty of Languages, National University of Modern Languages, Islamabad

Local orders are to be made by Online payment (Or) Pay Orders and Foreign orders by Bank Drafts

***ANNUAL* SUBSCRIPTION RATES** - Please select:

	Inland	Foreign
Individual Subscription	Rs. 3000/- (Including Postal Charges)	US$ 25/- (Excluding Postal Charges)
Institution Subscription	Rs. 3500/- (Including Postal Charges)	US$ 30/- (Excluding Postal Charges)

Address to which the journal is to be sent

Name …….

Address …….

……

Institution ……..

Contact Number ……

Email …….

DARYAFT

Vol:17, Issue:01

January - June 2025

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

"DARYAFT" is a HEC Recognized Journal

It is included in Following National & International Databases:

1. DOAJ (Directory of Open Access Journals)
2. Crossref
3. MLA database (Directory of Periodicals & MLA Bibliography)
4. Index Urdu Journal (IIUI),
5. International Scientific Indexing (ISI)
6. Scientific Indexing Services (SIS)
7. Tehqeeqat, A Research Indexing System
8. EuroPub (Directory of Academic and Scientific Journals)

Department of Urdu Language and Literature,
National University of Modern Languages, Islamabad

ADVISORY BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Heinz Werner Wessler
Department of Linguistics and Philology, Uppsala University, Sweden

Prof. Dr. Muhammad Golam Rabbani
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

Prof. Dr. Shafique N. Virani
Department for the Study of Religion, University of Toronto, Canada

Prof. Dr. Zia Ul Hassan
Graduate School of Humanities, University of Osaka, Japan

Dr. Arzu Ciftsuren
Department of Urdu, Istanbul University, Turkiye

Dr. Timsal Masud
Department of Middle Eastern, South Asian & African Studies, Columbia University, USA

ADVISORY BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Robina Shaheen
Dean, Faculty of Islamic and Oriental Studies, University of Peshawar, Pakistan

Prof. Dr. Saima Iram
Chairperson, Department of Urdu, Government College University, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Sohail Abbas Khan
Department of Urdu Language & Literature, University of Sargodha, Pakistan

Prof. Dr. Amir Sohail
Dean, Faculty of Art and Languages, Islamia University of Bahawalpur, Pakistan

Dr. Tariq Mahmood
Principal, College of Oriental Learning, Government College University, Faisalabad, Pakistan

Dr. Muhammad Asif
Department of Urdu, Bahauddin Zakariya University, Multan, Pakistan

EDITORIAL BOARD (INTERNATIONAL)

Prof. Dr. Khawaja Ekram ud Din
Department of Urdu, Jawaharlal Nehru University, New Delhi, India

Prof. Dr. Ibrahim Muhammad Ibrahim
Head, Department of Urdu, Al-Azhar University (Girls Campus), Cairo, Egypt

Prof. Dr. Recep Durgun
Department of Urdu Language and Literature, Selçuk University, Konya, Turkiye

Prof. Dr. Mohammad Raghib Deshmukh
Head, Department of Urdu, G.S. Science College, Khamgaon, Maharashtra, India

EDITORIAL BOARD (NATIONAL)

Prof. Dr. Abdul Aziz Sahir
Dean, Faculty of Social Sciences and Humanities, Allama Iqbal Open University, Islamabad, Pakistan

Prof. Dr. Muhammad Kamran
Director of the Institute of Urdu Language and Literature, University of the Punjab, Lahore, Pakistan

Prof. Dr. Tanzeem-ul-Firdous
Head, Department of Urdu, University of Karachi, Pakistan

Dr. Altaf Yousuf Zai
Chairman, Department of Urdu, Hazara University, Mansehra, Pakistan

FOR CONTACT
Department of Urdu Language & Literature,
National University of Modern Languages, H-9, Islamabad
Telephone: 051-9265100-10, Ext: 2262
E-mail: daryaft@numl.edu.pk
Website (OJS): *https://daryaft.numl.edu.pk/index.php/daryaft*

DARYAFT

Vol:17, Issue:01

January - June 2025

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

PATRON IN CHIEF
Maj. Gen. ® Shahid Mahmood Kayani HI (M) (Rector)

PATRON
Prof. Dr. M. Safeer Awan (Pro-Rector Research &Strategic initiatives Division)

CHIEF EDITOR
Prof. Dr. Jamil Asghar Jami (Dean Faculy of Languages)

EDITOR
Dr. Zafar Ahmed

CO-EDITOR
Dr. Abu Bakar Saddique Rathore

NATIONAL UNIVERSITY OF MODERN LANGUAGES

ISLAMABAD

ISSN Online: 2616-6038
ISSN Print: 1814-2885

DARYAFT

Research Journal

Volume: 17, Issue: 01
Jan-June 2025

Department of Urdu Language and Literature
National University of Modern Languages, Islamabad